بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

۸-۹ مارچ ۲۰۱۴ء بروز شنبہ ویکشنبہ مالیگاؤں میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کا عنوان تھا ''امام اعظم ابوحنیفہ کانفرنس''، اس میں شرکت کے لیے دور دراز کے اہل علم وفکر کو دعوت دی گئی تھی، متعدد اہل علم وقلم کے مقالات کے علاوہ دو روز کے اندر مختلف اوقات میں جلسۂ عام کے علاوہ مسالک اربعہ کو درپیش چیلنجوں سے خبردار کرنے کے لیے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقوں کی کئی ایک نشستیں بھی رکھی گئی تھیں، اس کانفرنس میں شرکت کے لیے راقم بھی مدعو تھا، اور اس نے ''امام اعظم ابوحنیفہ: محدثین ومعاصرین کی نظر میں اور ان کے فقہی اجتہاد پر عمل کرنے والے ان کے معاصر محدثین'' کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کر کے اہل علم کے اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی۔ یہ مقالہ اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

کانفرنس کے روح رواں مولانا ہلال احمد صاحب تھے، جو مالیگاؤں کے ایک نہایت متحرک اور فعال شخص ہیں، عصری اور دینی دونوں تعلیم سے بہرہ مند ہیں، مہاراشٹر کے مختلف شہروں کے ''فارمیسی کالج'' میں لیکچرر رہ چکے ہیں، اُس وقت بھی ان کے دینی مشاغل جاری تھے، اور اب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد اپنی پوری توجہ دینی تعلیم اور مذہبی سرگرمیوں کی طرف مبذول کر دی ہے، وہاں مجھے یہ دیکھ کر مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ انھوں نے - جو مالیگاؤں اور اس کے علاقے میں ''ہلال سر'' کے نام سے معروف ہیں - ایک نہایت مضبوط رابطہ گروپ بنا رکھا ہے، جو نہ صرف مالیگاؤں بلکہ مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور مدھیہ پردیش کے مختلف مقامات پر سرگرم عمل ہے، اور جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مذہب حنفی کو جو مسائل درپیش ہیں، اور ملت کے نوجوانوں میں غیر مقلدیت کا بڑھتا ہوا جو رجحان پرورش پا رہا ہے، اس کے سدباب کے لیے اور امت کو سیدھی اور سلف

صالحین جس راہ پر چلے ہیں اس کی طرف راہنمائی کے لیے منظم اور مستحکم کوشش کی جائے، اس کا اندازہ کانفرنس اور عام وخاص نشستوں کے شرکاء وسامعین کی اس بڑی تعداد کو دیکھ کر ہوتا تھا، جو وسطی اور جنوبی ہند کے مختلف مقامات سے سفر کر کے آئے تھے، اور پوری دلجمعی وتندہی کے ساتھ ان پروگراموں میں شریک رہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس کانفرنس کو نفع بخش وبارآور اور جس فتنے کو نظر میں رکھ کر منعقد کی گئی تھی، اس کے سدباب کا مؤثر ذریعہ بنائے۔

....

مالیگاؤں سے راقم کو اکل کوا جانے کا اتفاق ہوا، میرا واپسی کا ٹکٹ کانفرنس کے اگلے ہی روز تھا، لیکن وہاں پہنچنے کے بعد جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا کے بانی حضرت مولانا غلام محمد وستانوی مدظلہ العالی کے صاحبزادگان مولانا محمد حذیفہ وستانوی اور مولوی محمد اویس وستانوی کا اکل کوا کے لیے اصرار ہوا، ان لوگوں کی مخلصانہ دعوت اور اس پر اصرار کو نظر انداز کرنا مشکل تھا، اس لیے وہاں بھی حاضری کا ارادہ ہو گیا۔ وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ بانی مدرسہ تشریف نہیں رکھتے، وہ بیرون ملک کے سفر پر تھے، اس لیے ان کی ملاقات سے محروم رہا، لیکن ان کے صاحبزادگان سے مل کر خوشی کا احساس ہوا، خوشی اس بات کی ہوئی کہ نوجوان اور نوعمر ہونے کے باوجود میں نے ''صاحبزادگی'' کا اثر ان کے اوپر نہیں محسوس کیا، میں نے ان کو نہ صرف علم دوست بلکہ علمی مشاغل اور پڑھنے لکھنے کے کاموں میں دلچسپی رکھنے والا پایا، بڑے صاحبزادے مولانا محمد حذیفہ نے تو ادارے کی اکثر ذمہ داریوں کو سنبھال رکھا ہے، اور اپنے والد محترم مدظلہ کی غیر موجودگی میں انتظامی ذمہ داریوں کی خوش اسلوبی سے دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اور چھوٹے صاحبزادے مولوی محمد اویس ابھی زیر تعلیم ہیں، مطالعہ کے شوقین اور کتابوں کے دلدادہ معلوم ہوئے، حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے علمی وتحقیقی کاموں کی ان کے دلوں میں حد درجہ عقیدت واحترام ہے، چنانچہ انھوں نے بہت سے طلبہ کو تحریک دے کر ''المآثر'' کا خریدار بنایا اور اس کی خریداری میں اپنی طرف سے تعاون بھی کیا، اللہ رب العزت اس کے لیے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کو اس بات پر مسرت وافتخار بھی ہے کہ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ جامعہ کے ابتدائی دنوں میں اس کے سنگ بنیاد کے موقع پر سفر کی مشقت اٹھا کر وہاں تشریف لا چکے ہیں۔

اکل کوا گجرات ومہاراشٹر کی سرحد پر واقع ہے، ایک دورافتادہ مقام ہے، لیکن اس عظیم الشان تعلیمی ادارے نے اس کولوگوں کی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ حضرت مولانا وستانوی نے ۱۹۸۱ء میں جب یہ مدرسہ قائم کیا ہوگا، تو شاید خود ان کو بھی یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ یہ تعلیمی ادارہ اس قدر ترقی کرے گا۔ اس کی ترقی اور نہ صرف دینی تعلیم بلکہ عصری تعلیم کے متعدد شعبوں اور درسگاہوں کی تعمیر اور دینی ماحول میں سرکار سے منظور شدہ تعلیم کا انتظام یقیناً مولانا کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ بزرگوں کی دعاؤں، مولانا کے اخلاص، ان کے وسیع فکر اور مسلسل جد وجہد کا ثمرہ ہے، کہ آج دینیات کی وسیع پیمانے پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کی عصری اور دنیوی ضرورتوں کو بھی پورا کر رہا ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کو نظر بد سے بچائے، اور مزید ترقی عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۲۲ کا بقیہ

موافقت کا بیشک ذکر کیا ہے، لیکن اجماع کی نفی کہاں کی ہے؟ یا یہ نفی ان کے کلام سے کس طرح لازم آتی ہے؟

چوتھی بات یہ پوچھتا ہوں اگر بالفرض مولانا کے کلام سے یہ ساری باتیں لازم بھی آتی ہوں تو یہ صفائی کے ساتھ بتلانا نہ ہوا، پھر آپ نے یہ کیوں لکھا کہ ''مولانا نے کس صفائی سے بتلا دیا'' آخر ان غلط بیانیوں سے کیا حاصل؟ یہیں پر یہ بھی بتا دوں کہ مجیب صاحب کا ص ۲۴ میں یہ کہنا کہ ''امام نووی اس مسئلہ کو اجتہادی مسئلہ سمجھتے ہیں'' غلط بیانی سے خالی نہیں ہے۔ نووی کا جواب مجیب نے ص ۲۳ میں نقل کیا ہے اس میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ پھر مولانا عبدالحی کی عبارت میں بھی نووی ہی کا جواب مذکور ہے اس میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔ اور اس سے بڑی غلط بیانی مجیب کا یہ کہنا ہے کہ ''اجتہاد وسیاست دونوں کو دخل دیتے ہوئے اس کو نافذ فرمایا'' حالانکہ نووی کے کلام میں اس کا اشارہ تک نہیں ہے۔

جاری ہے

ماخوذ:ازتفسیرعزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۃ التکویر

موءودہ سے سوال کرنے کی حکمتیں:

موؤودہ سے سوال کرنے میں بہت سے اسرار ہیں، یہ بھی ہے کہ اس جہان میں اگرچہ شعور اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بچی کے اندر پیدا ہوجائے گی تاہم دنیا کے مشاق مقدمہ بازوں کی طرح نہ ہوگی اس لیے تلقینِ دعویٰ کے لیے اس سے یہ سوال ہوگا۔

یہ بھی ہے کہ جب وہ قتل کی گئی تھی اس کو تکلیف کا خاص احساس نہیں ہوا تھا، وہ زندگی تو اس کے لیے محض خواب کی طرح تھی، آنکھ کھولی تھی کہ ختم ہوگئی (اس لیے شاید اس کو یاد بھی نہ ہو کہ اس پر کسی نے ظلم کیا تھا)

یہ بھی ہے کہ ماں باپ پر پہل کرتے ہوئے دعویٰ کرنے میں شاید اس کو حیا آئے۔

ان ساری وجوہات کی بنا پر ضروری ہوا کہ اسے دعویٰ یاد دلایا جائے، اس انداز سے اس کے ساتھ بات کی جائے کہ اس کو دعویٰ کرنا آسان ہوجائے، جیسے کوئی ناسمجھ مظلوم جب اپنی بات اور دعویٰ پیش نہیں کرسکتا تو عدل وانصاف والے حکام اس کو دعویٰ کی خود تلقین کرتے ہیں تاکہ اس کے حقوق ضائع نہ ہوں، اسی طرح اگر کوئی دنیا میں ایسا مظلوم ہو جو ظالم کے خوف سے یا شرم سے اپنی بات صاف صاف نہ کرسکتا ہو تو اربابِ عدالت یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

فقہاء نے بھی ایسے موقع پر مدعی اور شاہد کو تلقین کرنا درست قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر مظلوم کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا۔

اس کے باوجود بظاہر والدین کے ساتھ اولاد کے ادب کی رعایت کی گئی ہے، کہ قاتل کا ذکر نہیں ہے، گویا قاتل سے کوئی سروکار نہیں ہے، یہ اس لیے تاکہ والد کی رسوائی نہ ہو، اسی لیے مجہول کا صیغہ لائے ہیں (اگرچہ نتیجتاً زبردست رسوائی ہے جیسا کہ آئندہ آرہا ہے)

سوال اس گناہ کے بارے میں ہوا جس کی وجہ سے قتل کی گئی ہے، گویا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ والدین کی اپنی اولاد کے ساتھ شفقت ومحبت ایسی ہوتی ہے کہ کسی عظیم گناہ کے بغیر تم سے یہ معاملہ نہ کیا ہوگا، اس لیے وہ گناہ بتاؤ کیا ہے؟ موءودہ سے سوال کرنے میں والدین کے ساتھ ادب کی رعایت درحقیقت ان کی رسوائی اور کمال ذلت کا سبب ہوگی، بالخصوص موءودہ سے گناہ کا سوال کرنا جب کہ وہ گناہ کی اہل ہی نہیں ہے والدین پر صریح الزام کی تعریض ہے، اگر بجائے اس کے پہلے ہی والدین سے براہِ راست سوال کیا جاتا کہ بے گناہ بیٹی کو کیوں قتل کیا، تو اس میں اس درجہ رسوائی اور خوف ودہشت ان پر اتنا طاری نہ ہوتا۔

اس میں یہ بھی ہے کہ ان کی کمال بدبختی وشقاوت ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ اس بدترین گناہ کی وجہ سے اللہ کے قہر وغضب کے اتنے مستحق ہوئے کہ ان سے یہ پوچھنا بھی گوارہ نہیں کہ انھوں نے اس کو کیوں قتل کیا، بلکہ خود مقتولہ بیٹی سے پوچھا جارہا ہے کہ اسے کیوں قتل کیا گیا، اگر ان سے براہِ راست خطاب وکلام کیا جائے تو کلام باری تعالیٰ کی لذت سے عذاب ومصیبت کی تکلیف میں کمی واقع ہوگی، چنانچہ کسی کا شعر ہے ۔

پُرسش اگر نیست بگونا سزا
کز دہنت یک سخنم آرزو است

الوائدة والموءودة فی النار کا مطلب:

حدیث میں آتا ہے **الوائدة والموءودة فی النار** جس عورت نے اپنی بیٹی زندہ گاڑی وہ اور اس کی بیٹی دونوں جہنم میں جائیں گی، یہ صحیح حدیث ہے، معتزلہ کو اس حدیث سے بہت حیرت ہوئی، اس کے مقابلے میں وہ اس آیت سے استدلال کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ رب جو کافر سے بیٹی کو زندہ دفنانے پر باز پرس کرے گا ممکن نہیں ہے کہ وہ خود اس موءودہ کو عذاب دے۔

ان لوگوں کا اس آیت سے استدلال کرنا پرلے درجے کی جہالت ہے، کیونکہ ماں باپ کو خونِ ناحق کی وجہ سے عذاب ہوگا اور موءودہ کو کفر میں ان کے تابع ہونے کی وجہ سے عذاب ہوگا، جیسے ظالم ومظلوم اگر دونوں کافر ہوں تو دونوں کو عذاب ہوگا، اصل عذاب جو کفر کی وجہ سے ہے وہ دونوں کو ہوگا، اگر چہ ظالم کو ظلم کی وجہ سے بھی ہوگا، اسی لیے اہل سنت کے نزدیک شریعت کے قاعدے کے

مطابق کفار کے بچوں کا معذّب ہونا ظاہر ہے، کیونکہ وہ ماں باپ کے ٹکڑے کی طرح ہیں، جب والدین کوعذاب دیا جائے گا ان کے ساتھ ان کی تبعیت میں نفسِ سادہ کو بھی عذاب دیا جائے گا۔

جیسے جڑواں بچے ہوتے ہیں خوشی، غم اور بھوک و پیاس ایک ساتھ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ابھی تک ان کا اتصال نفسانی الگ الگ نہیں ہوا۔ واللہ اعلم (۱)

بِاَیِّ ذَنۡبٍ قُتِلَتۡ

کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی

قُتِلَتۡ کے اندر نکتہ:

یہاں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ ''قُتِلَتۡ'' کا صیغہ لائے ہیں، جو غائب کا صیغہ ہے، مقام کا تقاضا یہ تھا کہ مخاطب کا صیغہ لاتے، کہ تجھے کیوں قتل کیا گیا؟ اس کا حل یہ ہے کہ یہاں اصل مقصود قیامت کے واقعات کو بیان کرنا ہے، کہ وہاں ایسا ایسا ہوگا، چنانچہ موءودہ کے بارے میں بتلایا کہ اس سے سوال کیا جائے گا کہ وہ کیوں قتل کی گئی، بعینہٖ وہاں جو اس سے سوال ہوگا خطاب کے صیغہ کے ساتھ اس کی حکایت نہیں ہو رہی۔

قتلِ اولاد کا دنیوی حکمِ شرعی:

اگر غلطی سے کسی کے ہاتھ سے اپنی اولاد ضائع ہو جائے، جیسے چار ماہ کے بعد حمل کا گرا دینا، یا اندازے سے زیادہ افیون کھلا دینا جس سے وہ ہلاک ہو جائے، یا حفاظت میں کوتاہی کی جیسے کوئی عورت بچے کو لے کر چھجے پر بیٹھی اس کو کھلا رہی تھی، اچانک بچہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور مر گیا، ایسی صورت میں فقہ میں حکم شرعی یہ مذکور ہے کہ کفارہ لازم ہوتا ہے۔

اور حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ قیس بن عاصم تمیمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا زمانۂ کفر میں مجھ سے بہت سنگین گناہ ہوا، کہ میری آٹھ بیٹیاں ہوئیں ان سب کو میں نے زندہ دفنا دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہر بیٹی کے بدلے میں ایک غلام

---

(۱) الوائدۃ والموءودۃ میں ایک تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ اس کا صلہ مقدر ہے تقدیر یوں ہے ''والموءودۃ لہا'' وائدہ سے مراد دایہ جو بچی کو دفناتی ہے اور ''موءودۃ لہا'' سے مراد بچی کی ماں جس کے حکم سے بچی کو دفنایا گیا ہے۔ اسی طرح مشرکین کے بچوں کے متعلق اہل السنّت کے ائمہ اربعہ سے توقف مروی ہے یا نجات (اشرف التوضیح) سفیر احمد

آزاد کرو، اس نے کہا میں اونٹوں والا ہوں، غلام تو میرے پاس نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک اونٹ ایک بیٹی کے بدلے میں اللہ کے راستے میں دو۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ○

اور جب اعمال نامے کھولے جائیں

نشرِ صحف کا مطلب:

یعنی وہ اعمال نامے جو لپیٹ کر سجین یا علیین میں رکھے گئے ہیں، کھول دیئے جائیں گے، جو کچھ ان کے اندر درج ہے ہر شخص وہ دیکھ لے گا۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اعمال نامے ہر انسان کے مرنے کے بعد لپیٹ کر رکھ دیئے جاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "نشـــــر" کا معنی بکھیرنے اور پھیلانے سے کیا ہے، یعنی اعمال نامے پھیلا دیئے جائیں گے، جس جگہ رکھے گئے ہیں وہاں سے نکال کر لوگوں میں بانٹ دیئے جائیں گے، کسی کو بائیں ہاتھ میں پشت کی طرف سے اعمال نامہ دیا جائے گا، کسی کو سامنے سے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

مرثد بن وداعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن پرچیاں عرش کے نیچے سے اڑائی جائیں گی، اڑتی ہوئی خود لوگوں کے ہاتھ میں آئیں گی، جو پرچہ ایماندار کے ہاتھ آئے گا اس پر لکھا ہوگا:

"**فی جنة عالية**" (اعلیٰ مرتبے کی جنت میں ہو) اور جو کافر کے ہاتھ میں آئے گا اس پر لکھا ہوگا "**فی سموم و حميم**" (گرم لُو اور کھولتے ہوئے پانی میں)

یہ پرچے فال کے قرعوں کی طرح ہوں گے، اعمال کے صحیفے نہیں ہوں گے، کشاف میں یہی مذکور ہے۔

وَاِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ○

اور جب آسمان کا پوست اُتار لیں

یعنی جس طرح جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کی پوست (کھال) اتار دیتے ہیں پھر اس کے تمام اعضاء اجزاء اور ریشے ظاہر ہو جاتے ہیں، ایسے ہی جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی، تو

فلک کی تمام پوشیدہ اشیاء صورِ مثالیہ میں ظاہر ہو جائیں گی، اور صحیفوں کو اٹھانے والے فرشتے اور دوسری قسم کے فرشتے اترنا شروع ہوں گے۔

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝

اور جب دوزخ دہکائی جائے

یعنی جب دوزخ بھڑکائی جائے گی، اس کی سوزش میں اضافہ ہو جائے گا۔

وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝

اور جب بہشت پاس لائی جائے

یعنی جب جنت محشر کے قریب لائی جائے گی، اس سے مسلمانوں کو خوشی پر خوشی اور کافروں کو حسرت پر حسرت ہوگی۔

یہ بارہ حادثے جن میں سے چھ صور پھونکنے سے پہلے دنیا میں اور چھ صور پھونکنے کے بعد ہوں گے، جب ہو چکیں گے تب

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ

جان لے گا ہر ایک جی جو لے کر آیا

یعنی ہر نفس جان لے گا وہ نیکی یا بدی میں سے کیا ساتھ لایا ہے۔

قیامت کے بارہ حادثات کا موت کے وقت سامنا:

بعض اہل تاویل نے کہا ہے کہ ان بارہ حادثات کے نمونہ کے طور پر موت کے وقت انسان کو بارہ حالتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے کہ موت قیامت کا نمونہ ہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے: ''من مات فقد قامت قیامتہ'' چنانچہ موت کو قیامت صغریٰ کہا جاتا ہے، وہ بارہ حالتیں جوان حادثات کا نمونہ ہیں وہ یوں ہیں کہ روح سورج کی طرح ہے، اس کی شعاع سے بدن زندہ رہتا ہے، جب روح کا تعلق جسم سے منقطع ہو گیا تو گویا سورج بے نور ہو گیا، اور ستاروں کے بکھرنے کا نمونہ انسان کے حواس اور قوتوں کا بیکار ہونا ہے کہ موت کے وقت انسان کے اعضاء و قویٰ بے کار ہو جاتے ہیں، اور پہاڑوں کا زلزلہ اس کا نمونہ اعضائے رئیسہ کا معطل ہونا اور بدن کی ہڈیوں کا ٹوٹ پھوٹ کر

برباد ہونا ہے۔

گابھن اونٹنی کے معطل ہونے کا نمونہ انسانی دودھ و چربی کا خشک ہونا ہے اور طبعی افعال کا رک جانا مثلاً جگر اور دیگر اعضاء جو آلات ہیں غذا کے ہضم وغیرہ کے، وہ سب بے کار ہو جاتے ہیں۔

اور وحشی جانوروں کے جمع ہونے کا نمونہ افعال بہیمیہ اور سبعیہ کے نتائج کا ظاہر ہونا ہے، یعنی نفرت انگیز کاموں کی بدنما شکلیں سامنے آئیں گی۔

دریاؤں کے بھڑکائے جانے کا نمونہ خون اور دوسری رطوبات کا خشک ہونا ہے، یا امیدوں، آرزوؤں کے خیالات واوہام کا فنا ہونا اس کا نمونہ ہے کہ یہ دریائے ناپیدا کنار ہے اور موت اضطراری یا اختیاری کے بغیر ان کا انقطاع ناممکن ہے۔

تزویج نفوس کا نمونہ ملکات مکسوبہ (کسب شدہ) کا جمع ہونا ہے، نورانی ملکات جمع ہوں گے نورانی ملکات کے ساتھ اور ظلمانی ملکات ظلمانی ملکات کے ساتھ جمع ہوں گے۔

موءودہ کا نمونہ انسان کی وہ قوت ہے جو اس نے اپنے مصرف پر استعمال نہیں کی کسی غیر مصرف پر اسے برباد کیا، تو انسان سے اس کی قوت وصلاحیت کے بارے میں گویا سوال ہوگا کہ کہاں صرف کی؟

دل پر وارد ہونے والے علمی نکتہ کی حفاظت:

بعض دانشوروں کا قول ہے اگر کوئی نفیس علمی نکتہ اذکیاء کے دل پر گذرے اس کو لکھ کر محفوظ نہ کرنا اور یوں ہی بھلا دینا موءودہ کے حکم میں ہے۔

آسمان کی کھال اتارنے کا نمونہ موت کے بعد روح کے احکام کا ظاہر ہونا ہے، اور تسعیر جحیم کا نمونہ موت کے بعد کی سختیاں اور شدائد ہیں جو انسان دیکھے گا، بہشت کے قریب لانے کا نمونہ موت کے بعد نیک روحوں کو ملنے والی خوشی اور راحت ہے جس سے گنہگار محروم ہوں گے۔

اور بعض اہل تصوف نے ان سب حالتوں کو سلوک کے مراتب طے کرنے پر منطبق کیا ہے کہ ابتدائے سلوک سے لے کر فنا تک جو منازل آتی ہیں ان پر ان کا انطباق کیا ہے، اس کی تفصیل بہت ہی زیادہ لمبی ہے اس تفسیر کا محل نہیں اس لیے اس کو چھوڑتے ہیں۔

نفسِ انسانی پر خیر وشر کی حقیقت کھلنے کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں، ان کی خبر اللہ تعالیٰ

نے دی ہے جو سچائی کا خالق اور اصدق الصادقین ہے، اس خبر کے یقینی ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا اس لیے یقین دلانے کے لیے قسم کھانے کی حاجت نہیں چنانچہ فرمایا:

فَلَا اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝

سو قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانے والوں

اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝

سیدھے چلنے والوں دبک جانے والوں کی

فَلَا اُقْسِمُ، ''پس قسم نہیں کھاتا ہوں'' کیونکہ جب خبر میں نے دی ہے تو قسم کھانے کی حاجت نہیں، لیکن اگر اس کے باوجود تمھیں قسم کی ضرورت ہے تو (سنو) بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝ میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، سیدھے چلنے والے، دبک جانے والے ستاروں کی۔

الْخُنَّسِ، الْجَوَارِ، الْكُنَّس کی تفسیر:

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور اکثر مفسرین صحابہ سے منقول ہے کہ ان سے مراد پانچ مشہور ستارے ہیں جن کو ''خمسہ متحیرہ'' کہا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد۔ ان کی حرکت تبدیل ہوتی رہتی ہے اس لیے ان کو متحیرہ کہتے ہیں، پہلے ان کی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے، ان کی یہ حرکت برجوں کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے، یعنی ''حمل'' سے ثور میں، ثور سے جوزاء میں جاتے ہیں، اس کے بعد تھوڑے دن ان کی حرکت دکھائی نہیں دیتی یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک جگہ پر کھڑے ہیں، پھر الٹی حرکت شروع کرتے ہیں یعنی پہلی حرکت کے خلاف، جس طرف سے آئے تھے اسی طرف واپس جانے لگتے ہیں یہ حرکت مشرق سے مغرب کی طرف ہوتی ہے۔

علم ہیئت کی اصطلاح میں ان کی پہلی حالت کو ''استقامت'' کہتے ہیں دوسری حالت کو ''وقوف'' اور تیسری حالت کو ''رجعت'' کہتے ہیں، یہ تین حالتیں کسی اور ستارے میں نہیں پائی جاتی، مثلاً سورج تھوڑا سا وقوف رکھتا ہے مگر رجعت اس میں نہیں، اور دیگر ستارے وقوف رکھتے ہیں نہ رجعت۔

ستاروں کے تغیرات ان کے فنا کی دلیل ہیں:

ان پانچ ستاروں میں حرکتوں کی تبدیلی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ عالم افلاک فنا کی زد میں ہے، نیز ان ستاروں اور تمام آسمانی چیزوں میں پیدا ہونے والے کسی بڑے انقلاب کے امکان کا ثبوت ہے۔

علم ہیئت والوں کے نزدیک خمسہ متحیرہ کی مختلف حالتوں کی وجہ:

ماہرین ہیئت نے ان پانچ ستاروں میں رونما ہونے والی ان تین حالتوں استقامت، وقوف، رجعت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حوامل اور ان کی تداویر کی مختلف حرکتوں کی وجہ سے یہ مختلف حالتیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ (۱)

تفصیل یہ ہے کہ حوامل مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتے ہیں اور ان کے اندر جو دائرے (تداویر) ہیں وہ چونکہ زمین کو شامل نہیں ہیں اس لیے ان کا اوپر والا حصہ مغرب سے مشرق کی طرف اور نیچے کا حصہ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے، ستارے دائروں کے اندر، دائرے حوامل کے اندر اور حوامل آسمان میں جڑے ہوئے ہیں، جب ستارے دائرے میں گڑھے ہوئے اور دائرے حوامل کے اندر ہوئے تو ستاروں کی دونوں حرکتیں شرقاً غرباً جو نظر آتی ہیں وہ بالتبع ہوئیں، ان کی اپنی حرکت نہ ہوئی۔

جب تک حوامل ودوائر کی حرکت موافق رہتی ہے، ستاروں کی حرکت تیز معلوم ہوتی ہے، اور سیدھی ہوتی ہے، سو یہی حالت ان کی استقامت کہلاتی ہے۔

اور حوامل ودوائر کی حرکت موافق نہ رہے تو ستاروں کی رفتار سست نظر آتی ہے، پھر جب حوامل ودوائر کی حرکت بالکل ایک دوسرے کے معارض ہو جائے کہ ایک حرکت سے ستارہ آگے بڑھا پھر اس کے خلاف دوسری حرکت سے پیچھے ہٹا تو اس وقت ستارہ ایک جگہ رکا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہی حالتِ وقوف ہے، لیکن جب دوسری حرکت غالب آ جائے تو تیزی سے ستارہ جدھر سے گیا تھا اسی طرف واپس مڑا ہوا معلوم ہوتا ہے یہی رجعت ہے۔ (۲)

---

(۱) قولہ حوامل: افلاک علویہ یعنی فلکِ زحل، فلکِ مشتری اور فلکِ مریخ اسی طرح افلاکِ سفلیہ یعنی فلک، زہرہ، عطارد اور فلک قمر سب کو حوامل کہتے ہیں، حوامل حامل کی جمع ہے یہ اپنے اندر تداویر کو اٹھائے ہوئے ہیں اس لیے ان کو حوامل کہتے ہیں۔
تداویر: ان افلاک کے اندر چھوٹے چھوٹے اور آسمان ہیں ان کو تدویر کہتے ہیں، تدویر ایسا فلک ہے جس کی دونوں سطحیں متوازی نہیں ہوتیں اور یہ مرکزِ عالم اور زمین کو محیط نہیں ہوتا بلکہ اپنے حوامل میں ایک طرف واقع ہوتا ہے۔۱۲-سفیر احمد، افاداتِ شیخ موسیٰؒ

(۲) یہ علم ہیئت کی خالص فنی بات ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے فن کی کتب کی طرف مراجعت کرنی چاہئے البتہ تفسیر حقانی میں یہی بات نسبتاً آسان اسلوب میں آ گئی ہے اسی کو یہاں نقل کیا جاتا ہے: فلاسفۂ قدیم کہتے ہیں کہ: ''آسمان کی موٹائی میں ایک دوسرا آسمان ہے اس کو حامل کہتے ہیں اور حامل میں ایک گول پہیہ سا لگا ہوا ہے جس کو تدویر کہتے ہیں، اس تدویر میں ستارہ جڑا ہوا ہے پھر اس ستارہ کو لے کر تدویر گھومتی ہے اور گھومتی ہوئی تدویر کو لے کر حامل گھومتا ہے اس گھومنے میں تدویر اور حامل کی حرکت موافق ہو تو =

ستاروں کی حالت کی تبدیلی کی کوئی وجہ ہو اس سے مقصود پر کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس سے اور زیادہ مقصود واضح ہو جاتا ہے کہ آسمان کے ستارے تغیر وانقلاب قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور اس بحث سے یہی ثابت ہوا کہ ان کی مختلف حرکتوں اور وضعوں کے اسباب مختلف ہیں، اور ان کے اندر تخالف وتجاذب طبعی ارادی ثابت ہو، لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ صدمات (ٹوٹ پھوٹ) قبول کر سکتے ہیں یعنی خراب وفنا ہو سکتے ہیں، جو چیز تغیر سے محفوظ ہو، اس میں کوئی انقلاب واقع ہونے سے تعجب ہو سکتا ہے، لیکن جو چیز تغیر کو قبول کرتی ہو اس میں اگر کوئی انقلاب واقع ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں [۱]

خمسہ متحیرہ کو خاص طور پر ذکر کرنے کی حکمت:

ان پانچ ستاروں کو یہاں اس لیے ذکر کیا کہ ستارے دو قسم کے ہیں:

۱:- جن کو سیارات کہتے ہیں یعنی چلنے والے وہ سات ہیں۔

۲:- دوسری قسم کو ثوابت کہتے ہیں یہ اپنی جگہ پر ٹھیرے رہتے ہیں۔

سیارات کو افلاک کے متعدد ہونے کی وجہ سے مختلف حرکتیں لاحق ہوتی ہیں، اور ثوابت کو مختلف حرکتیں نہیں ہوتی بلکہ ان کے فلک کی حرکت بھی بہت سست اور کم دکھائی دیتی ہے، ثوابت کو رجوع، استقامت اور وقوف کی حالتیں درپیش نہیں آتیں، نہ ہی ان کو رفتار کی تیزی یا سستی والی حالت پیش آتی ہے، البتہ سیارات کو یہ سب کچھ درپیش آتا ہے، اور سیاروں میں سے سورج اور چاند کو قرآن کریم میں بارہا تغیر وانقلاب کے مقام میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور ان دونوں کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیاں اور تغیرات عام وخاص میں مشہور ہیں، چاند کا تغیر تو ہر مہینے دیکھنے میں آتا ہے، وہ گھٹتا بڑھتا ہے، اسی طرح سورج گرہن اور چاند گرہن بھی سب کو معلوم ہے۔

اس مقام پر چونکہ آسمانی تغیر بیان کرنا اصل مقصد ہے اور اجرام فلکی میں سے ان پانچ

=ستارہ سیدھا چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اگر مخالف ہو تو ستارے کی رفتار سست محسوس ہوتی ہے پھر وہ مخالفت اگر اس درجہ تک ہے کہ جس قدر ستارہ ایک کی حرکت میں ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور اگر مخالف حرکت غالب آکر اس کو الٹا ادھر ہی لانے لگے جدھر سے وہ چلا تھا تو اس وقت ستارہ الٹا حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے" تفسیر حقانی ج ۵ ص ۵۵، ۲۵۰۔ ۱۲ اسفیر احمد

(۱) فلاسفۂ قدیم اجرامِ فلکی کے قِدم کے قائل تھے اسی وجہ سے اجرام فلکی کے فنا کے بھی قائل نہ تھے، اور اسلام نے ان چیزوں کے فنا کی خبر دی ہے اس لیے حضرت مصنفؒ ان کی تردید کر رہے ہیں البتہ جدید سائنس نے اسلام کی تصدیق کر دی ہے۔ ۱۲ اسفیر احمد

سیاروں کے اندر بھی تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے، اس لیے موقع کی مناسب سے ان پانچ ستاروں کو خصوصیت سے ذکر فرمایا۔

اسی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ثوابت'' کا آپس میں کوئی ربط نہیں ہے، اسی وجہ سے ان کا ایک ہی حال ہے، ان کے مقابلے میں ان پانچ ستاروں کا آپس میں بھی اور سورج و چاند کے ساتھ بھی ربط و جوڑ کئی طرح سے ہے، یہ متعدد قوتوں کے مصدر و منبع ہیں اور سورج کے ساتھ عجیب و غریب ارتباطات رکھتے ہیں، ان کے ہر ارتباط میں ایک نئی تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔تو یہ پانچ ستارے عالم افلاک میں مرکبات عنصریہ کی مانند ہوئے جیسے (زمین کے اندر) معادن، نباتات، حیوانات اور انسان ہیں اور ان چاروں کی برزخیں (یعنی ان سب کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے والی رکاوٹ) اور سورج و چاند مرکبات ناقصہ کے مانند ہیں، جیسے (زمین کے اندر) غبار، بخارات اور دھواں ہے اور ''ثوابت'' عنصریہ بسائط کی مانند ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ ان پانچ سیاروں کی تاثیرات، ان کے افعال اور ان کی حرکتیں اختیار و ارادہ کی صلاحیت رکھنے والوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں، ان کی حرکتیں ایسی ہیں گویا یہ اپنے اختیار سے حرکتیں کر رہے ہیں، کیونکہ ان کی حرکات مرکب ہیں صعود، ہبوط، توجہ، رجوع، ہرب اور طلب سے (یعنی یہ کبھی اوپر چڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی نیچے اترتے ہوئے، کبھی آگے چلے جاتے ہیں اور کبھی واپس آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یہ سب ایسی حرکات ہیں جیسے کوئی اپنے شعور اور ارادہ سے یہ حرکتیں کر رہا ہو)

لہٰذا ان پانچ سیاروں میں رونما ہونے والا تغیر اور انقلاب مقصد کے زیادہ قریب ہے (یعنی قرآن جو مقصد انسانوں کو سمجھانا چاہتا ہے اور وہ ہے اس عالم کا فنا ہونا اس مقصد کے یہ زیادہ قریب ہے) اس لیے کہ ان کا انقلاب ارادی ہے طبعی نہیں۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ ان پانچ ستاروں کی حالتیں اولاً تو اجرام فلکی کے اندر انقلاب کے ممکن ہونے پر دلیل ہیں۔

ثانیاً:- زمین اور اس کی ساری اشیاء میں انقلاب کی دلیل ہیں، اس لیے کہ جب اجرام فلکی میں تغیر و انقلاب ممکن ہو گیا تو زمین میں ہونے پر کیا اشکال ہو سکتا ہے، رات دن یہاں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور وہ نظر آتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ زمین اور اس کی تمام اشیاء تغیر پذیر ہیں۔

اور اگر اس انقلابِ عظیم کے رونما ہونے میں کسی کو شک ہو تو دوسری قسم کھائی جاتی ہے۔

جاری ہے

الازہارالمربوعہ

باب دوم

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مجیب صاحب کا تیسرا جواب یہ ہے کہ ''حضرت عمر کا یہ حکم اجتہاداً تھااور ظاہر ہے کہ کسی مجتہد کا اجتہاد ناسخ نہیں ہوسکتا'' (آثار ص ۳۰)

ناظرین مجیب صاحب کا یہ جواب بار بار پڑھیں اوران کی حواس باختگی کی داددیں۔ حضرت عمرؓ کے حکم کوکون ناسخ کہہ رہا ہے جوآپ اس کے ناسخ نہ ہوسکنے کا اعلان کررہے ہیں، علاوہ بریں یہاں حضرت عمرؓ کے حکم کا کیا ذکر؟ یہاں تو ابن عباسؓ کے فتوے کی بحث ہورہی ہے۔ مجیب صاحب ہوش کی دوا کیجئے، باقی اس جواب کو بزبان مولانا عبدالحی وعلامہ آلوسی جوآپ نے قرار دیا ہے تو یہ صریح غلط بیانی ہے، اگرآپ سچے ہیں تو بتایئے کہ کس قائلِ وقوع ثلاث نے حضرت عمرؓ کے حکم کو ناسخِ حدیث کہا ہے؟ اوراس کا جواب کہاں پر علامہ آلوسی یا مولانا عبدالحی نے یہ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ یا کسی مجتہد کا اجتہاد ناسخ نہیں ہوسکتا؟ عقل سے کام لیجئے، ایسی بات کون کہے گا جو یہ حضرات اس کا جواب دیں۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ امام شافعیؒ کوخوداس کا یقین نہ تھا کہ یہ حدیث منسوخ ہے فرماتے ہیں: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس کواس حدیث کے ناسخ کا علم ہوگیا تھا...... یہ نہیں فرماتے کہ ابن عباس کوناسخ کا علم تھا (آثار ص ۳۱)

میں کہتا ہوں: اولاً اسی میں کلام ہے کہ امام شافعیؒ کو یقین نہ تھا، اس لیے کہ جس لفظ سے مجیب صاحب یقین کی نفی سمجھ رہے ہیں وہ یقین کی نفی پردلالت نہیں کرتا، امام شافعیؒ کا لفظ الذی یشبہ ہے، جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''وہ بات جوحق کے مشابہ ہے'' مجیب نے اس کا ترجمہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے'' کیا، اوراپنے اسی ترجمہ پرنفی یقین کی بنیادرکھی ہے، جوسراسر خلاف دیانت ہے، جولوگ ائمہ وعلمائے متقدمین کے اسلوب کلام سے واقف ہیں ان پرمخفی نہیں ہے کہ وہ حضرات اپنی یقینی تحقیقات کو

بھی غایت احتیاط کی بنا پر اسی قسم کے الفاظ سے بیان کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن قیم اور دوسرے مخالفین نے مجیب صاحب کی طرح اس رکیک جواب کا ذکر نہیں کیا۔

ثانیاً:- اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امام شافعی کو یقین نہ تھا تو اس سے کیا ہوا؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ جب تک نسخ کا یقین نہ ہو اس وقت تک ناسخ معمول بہ اور منسوخ متروک العمل نہیں ہوسکتا، اگر یہ خیال ہے تو خبر واحد سے بھی نسخ کا ثبوت نہ ہو سکے گا، اس لیے کہ خبر واحد سے بھی نسخ کا صرف ظن حاصل ہوگا نہ کہ یقین، جیسا کہ اصول حدیث میں مصرح ہے، پس آپ کے نزدیک وہاں پر بھی ناسخ معمول بہ اور منسوخ متروک العمل نہیں ہوسکتا، حالانکہ یہ بالکل باطل اور تصریحات فقہا ومحدثین کے خلاف ہے۔ اصل یہ ہے کہ ثبوت نسخ کے لیے نسخ کا یقین ضروری نہیں ہے، بلکہ ظن غالب کافی ہے، اور ظن غالب نسخ کا امام شافعی کو حاصل تھا، چنانچہ ابن القیم نے اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں: **فمنهم من ترک القول بحديث ابن عباس لظنه أنه منسوخ وهذه طريقة الشافعي**، یعنی بعض ائمہ اس ظن کی وجہ سے کہ حدیث ابن عباس منسوخ ہے اس کے قائل نہ ہوئے اور یہ طریقہ امام شافعیؒ کا ہے (اعلام ص ۲۷)

بہر حال مذکورہ بالا وجہ کی بنا پر اگر نسخ احتمالی ہے تو آپ کو کوئی نسخ ایسا نہ ملے گا جو احتمالی نہ ہو الا ماشاء اللہ۔ اور مولانا عبدالحی نے کہیں بھی اس وجہ سے اس نسخ کو احتمالی وادعائی نہیں لکھا ہے۔ یہ بھی آپ کی غلط بیانی ونافہمی ہے۔

مجیب صاحب کے جوابات ختم ہو گئے، لیکن ابھی ان کے عجائب ختم نہیں ہوئے۔ اس بحث کی ابتدا میں انھوں نے فہم ودیانت کے چند ایسے شاہکار پیش کیے ہیں جن کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

۱:- ص ۲۴ میں علامہ آلوسی کی عبارت کا ایک ناقص ٹکڑا نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ”علامہ آلوسی کی بے چارگی قابل رحم ہے، کس مایوسانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ حق تو یہی ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایسی تین طلاقوں پر ایک رجعی کے واقع ہونے کا حکم تھا اور یہ حکم دور فاروقی میں اجتہاداً بصورت روایت وقوع ثلاث کا ہو گیا، نہ تو پہلا حکم منسوخ ہے نہ متروک، لیکن مجبوری ہے تو صرف یہ ہے کہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے“۔

میں کہتا ہوں کہ مجیب صاحب نے یہ لکھ کر خواہ مخواہ اپنے فہم ودیانت کو رسوا کیا۔ خود علامہ

آلوسی کے کلام کا مطلب نہیں سمجھے اور اس لیے مذہبی تعصب کے جوش میں علامہ آلوسی پر آوازہ کسنے لگے۔

ناظرین! مجیب صاحب نے علامہ آلوسی کی پوری عبارت نہیں لکھی، ورنہ ان کے جھوٹ سچ کا حال اچھی طرح کھل جاتا، جو عبارت مجیب نے نقل کی ہے اس سے پہلے آلوسی نے حدیث مسلم لکھ کر یہ فرمایا ہے کہ اگر حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں ''کہ تین طلاق آنحضرت ﷺ کے عہد میں ایک تھی'' غیر مدخولہ عورت کو ایک مجلس میں تین طلاق تین لفظوں کے ساتھ دینا مراد ہے، تو یہ مسئلہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں بھی اجتہادی تھا اور صحیح روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ ایسا کوئی واقعہ حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوا ہو اور آپ نے اس بارے میں کچھ فرمایا ہو، ایسی صورتیں شاید دور کی جگہوں میں اور وہ بھی آپ کے آخری زمانہ میں واقع ہوتی تھیں اور اہل علم صحابہ ان کو ایک کے حکم میں قرار دیتے ہیں، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کے کلام میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ خود حضورؐ ایک قرار دیتے تھے۔

بہر حال جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو خلافت کے چند ایام گذرنے کے بعد ان کو اجتہاد سے یہ ظاہر ہوا کہ اس صورت میں (یعنی غیر مدخولہ کو ایک مجلس میں تین طلاق بسہ الفاظ دینے کی صورت میں) تین طلاق واقع ہونے کا قول اولی ہے۔ اس کے بعد علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ لیکن یہ یعنی حضرت عمرؓ کا غیر مدخولہ کے باب میں یہ قول ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ اس بیان کا حاصل یہ ہے کہ علامہ آلوسی نے حدیث مسلم کو طلاق غیر مدخولہ والی صورت پر حمل کیا ہے اور اس حمل کی صورت میں حدیث مذکور مذہب حنفی کے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ غیر مدخولہ کے طلاق کی اس صورت کا حکم حنفی مذہب میں بھی یہی ہے۔ ۲- اور انھوں نے حدیث مسلم کو مرفوع نہیں مانا ہے، بلکہ صحابہ پر موقوف قرار دیا ہے۔ ۳- اور انھوں نے یہ لکھا ہے کہ طلاق غیر مدخولہ کی مذکورہ بالا صورت کا حکم کسی حدیث مرفوع میں مذکور نہیں ہے بلکہ صرف اجتہادی ہے۔ ۴- اور انھوں نے اسی طلاق غیر مدخولہ کی اس صورت میں حضرت عمرؓ کا اجتہاد اور تین واقع ہونے کا قول لکھا ہے۔ ۵- اور انھوں نے حضرت عمرؓ کے اسی اجتہاد کو اپنے مذہب کے خلاف لکھا ہے۔

آلوسی کے کلام کی اس توضیح وتشریح کے بعد میں مجیب صاحب سے پوچھتا ہوں کہ ان کی

عبارت کا جو ٹکڑا آپ نے نقل کیا ہے اس سے آپ کا کیا منشاء ہے؟ اگر یہ کہ آلوسی حدیث مسلم کو منسوخ نہیں مانتے تو میں کہتا ہوں کہ آلوسی اس کو منسوخ کیوں مانیں گے، وہ تو حدیث کو حدیث مرفوع اور حکم نبوی ہی نہیں سمجھتے، بلکہ صحابہ کا موقوف اور ان کا اجتہاد سمجھتے ہیں، اور اجتہادیات میں نسخ نہیں ہوا کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ آپ نے آلوسی کا کلام نہیں سمجھا۔ اور یہیں سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ آلوسی کا کلام آپ کے لیے سخت مضر ہے، اس لیے کہ ان کے قول سے روایت مسلم، حدیث نبوی ہی نہیں رہتی جیسا کہ ابن حزم کا خیال ہے۔

اور اگر آپ کا یہ منشاء ہے کہ آلوسی نے تسلیم کرلیا کہ عہد نبوی وصدیقی میں مطلقاً تین طلاقوں پر ایک رجعی کا حکم ہوتا تھا۔ تو یہ بالکل افترا اور خیانت ہے، اس لیے کہ انھوں نے جن تین طلاقوں کا ایک ہونا عہد نبوی وصدیقی میں تسلیم کیا ہے، وہ تین طلاقیں وہ ہیں جو غیر مدخولہ کو تین لفظوں میں دی جائیں، جیسا کہ آلوسی نے خود اس کو صاف صاف لکھا ہے۔ اگر کہئے کہ میری بھی یہی مراد ہے، تو میں پوچھوں گا کہ پھر اس کے نقل کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ ہمارے خلاف کب ہے؟ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ غیر مدخولہ کو تین طلاقیں تین لفظوں میں دی جائیں تو ایک ہی طلاق پڑتی ہے۔ علاوہ بریں اگر آپ کی یہی مراد ہوتی تو آپ ''رجعی'' کے لفظ کا اضافہ اپنی طرف سے کر کے غلط بیانی کے مرتکب نہ ہوتے، آلوسی نے ''رجعی'' کا لفظ کہاں لکھا ہے؟

اور اگر آپ کا منشاء یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت عمرؓ مطلقاً ایک مجلس کی تین طلاقوں کے ایک ہونے کو جائز خیال فرماتے تھے، جیسا کہ آپ نے ص ۲۴ کی آخری سطر میں لکھا ہے، تو یہ بھی آلوسی پر افترا ہے، اس لیے کہ ان کے جس لفظ سے آپ یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں وہ اسی مذکورہ بالا صورت میں ہے، یعنی ان تین طلاقوں کے باب میں جو غیر مدخولہ کو بسہ الفاظ دی جائیں۔ پس اس سے یہ ثابت ہوگا کہ غیر مدخولہ کو جو تین طلاقیں تین الفاظ میں دی جائیں حضرت عمر ان تینوں کے واقع ہونے کو اولی سمجھتے ہیں، یعنی اس صورت میں حضرت عمرؓ ایک ہونے کو بھی جائز خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ تین طلاقیں جو مدخولہ کو بیک یا بسہ لفظ دی جائیں یا غیر مدخولہ کو بیک لفظ دی جائیں ان سب کو حضرت عمرؓ بھی تین سمجھتے تھے۔ اور یہ ہمارے خلاف نہیں ہے۔

اس کے بعد جو سوقیانہ لفظ آپ نے لکھا ہے، اس کو نقل کرنا بھی میں گوارا نہیں کرسکتا، تا

بجواب چہ رسد۔سب سے آخر میں یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ علامہ آلوسی کی جس تقریر کا ماحصل میں نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کو علامہ نے ذکر تو ضرور کیا ہے، مگر وہ تقریر خود ان کے نزدیک بھی پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک بھی بہترین جواب روایت مسلم کا وہی ہے جو امام شافعیؒ نے دیا ہے، یعنی دعویٰ نسخ۔ پس جو تقریر علامہ آلوسی کی پسندیدہ نہیں ہے اس کے کسی ٹکڑے کو لے کر اور اس کے مفہوم کو بھی مسخ کر کے شور وغل مچانا مجیب صاحب ہی کا کام ہوسکتا ہے۔

۲-آثار ص ۲۵ میں مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کے عمدۃ الرعایۃ ج ۲ ص ۶۷ کی ایک عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ''مولانا عبدالحی نے کس صفائی سے یہ بتلا دیا کہ حضرت عمر کا حکم سابقہ مسئلہ کے خلاف نہیں۔یعنی پہلا حکم جو عہد نبوی اور عہد صدیقی میں تھا وہ منسوخ نہیں، اور یہ کہ حضرت عمر کا یہ حکم صرف سیاست ہی پر مبنی نہیں ہے جیسا کہ اور فقہائے احناف نے لکھا ہے، بلکہ سیاست کے ساتھ اجتہاد کی چاشنی بھی ملی ہوئی ہے۔اور یہ اعتراض سے وراء الوراء ہے۔اور یہ کہ صحابہ نے اسی وجہ سے مخالفت نہ کی، اگر حکم نبوی کو منسوخ کیا جاتا تو ضرور وہ مزاحم ہوتے......اور یہ کہ اس اجتہادی مسئلہ پر اجماع نہیں بلکہ جمہور صحابہ نے موافقت کی ہے۔''

مجیب صاحب نے اس بیان میں پے در پے غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اور مولانا عبدالحی رحمہ اللہ پر افتراؤں کا طومار باندھ دیا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنی بے سمجھی کا بھی مختلف وجوہ سے مظاہرہ کیا ہے۔ پہلے مولانا عبدالحی کی عبارت کا ترجمہ سنیے! مولانا نے یہ فرمایا ہے کہ جو لوگ تین طلاق واقع ہونے کے قائل ہیں وہ حدیث مسلم کا متعدد جواب دیتے ہیں۔سب سے اچھا جواب وہ ہے جس کو نووی وغیرہ نے ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں اور اس کے بعد لوگ تین لفظوں سے طلاق دیتے تھے اور اس سے ایک طلاق مراد لیتے تھے اور باقی دو لفظوں سے اسی پہلی طلاق کی تاکید کا ارادہ کرتے تھے۔ پس اسی وجہ سے (اس زمانہ کی) تین طلاقوں کو ایک کا حکم دیا جاتا تھا، پھر جب کثرت سے لوگ تین طلاقیں دینے لگے اور نیتیں مختلف ہوگئیں اور نیت پر حکم لگانا مشکل ہوگیا، تو حضرت عمرؓ نے تینوں کے نافذ ہونے کا حکم دیا۔اور جمہور صحابہ نے ان کی موافقت کی۔ پس حضرت عمرؓ کا یہ حکم شرع ثابت کے خلاف نہیں ہے اور نہ وہ محض سیاست پر محمول ہے، اس لیے کہ کسی صحابی کے ساتھ یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی حکم شرعی کو بدل دیں گے، چہ جائے کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ یہ گمان کیا جائے۔

مولانا کی اس تقریر سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

۱- حدیث مسلم میں تین طلاقوں کے ایک ہونے کا جو بیان ہے وہ خاص اس صورت کا حکم ہے جب تین لفظوں سے طلاق دی جاتی تھی، لیکن مقصود صرف ایک طلاق دینا ہوتا تھا، باقی دولفظوں سے اسی پہلی طلاق کا مؤکد کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اور ہر واقف کار جانتا ہے کہ اس خاص صورت میں تین کا ایک ہونا مذہب حنفی کے خلاف نہیں ہے۔

۲- اس خاص صورت میں بھی تین کے ایک ہونے کا حکم اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب نیتوں پر حکم لگانا مشکل نہ ہو، لیکن جب نیتوں پر حکم لگانا مشکل ہو جائے تو بوجہ اس کے کہ نیتیں مختلف کی جانے لگیں، اور قلتِ خیر وصلاح وغلبۂ شر وفساد کی وجہ سے طلاق دینے والوں کے بیانات بھی قابل اعتماد نہ رہ جائیں تو اس صورت میں بھی تین کو ایک کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

۳- یہی وجہ ہے کہ جب نیتوں پر حکم لگانا مشکل ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے تین کے تین ہونے کا حکم دیا۔ پس جب تین کے ایک ہونے کی صورت دوسری تھی اور تین کے تین ہونے کی صورت دوسری تو حضرت عمرؓ کا حکم شرع ثابت کے خلاف نہ ہوا، اس لیے کہ جس صورت میں حضرت عمرؓ نے تین کے تین ہونے کا حکم دیا اس صورت میں ایک ہونا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ اور جب یہ دونوں حکم الگ الگ صورتوں کے ہیں تو ان میں کوئی ناسخ اور کوئی منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر باقی رہا، ناسخ ومنسوخ تو وہاں ہوا کرتے ہیں جہاں دو حکموں میں تعارض ہو۔

۴- یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ حکم نبوی وحکم فاروقی کو ایک ہی صورت میں مان کر حضرت عمرؓ کے حکم کو محض سیاست پر محمول کرتے ہیں، ان کا قول صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس قول پر لازم آئے گا کہ حضرت عمرؓ نے حکم نبوی کو محض سیاسۃً بدل دیا، حالانکہ حضرت عمرؓ بلکہ کسی صحابی کے متعلق یہ وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سیاسۃً ہی سہی کسی حکم نبوی کی تبدیلی کرے گا۔ پس صحیح یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا حکم سیاسۃً نہیں تھا بلکہ دوسری صورت کے متعلق تھا۔

مولانا کے کلام کی اس توضیح کے بعد مجیب سے پہلی بات پوچھتا ہوں کہ کیا آپ مولانا کی اس تقریر کو قبول وتسلیم کرتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو چلیے قصہ پاک ہوا، اگر آپ مولانا کی تقریر کو صحیح مانتے ہیں تو ہم بھی مانے لیتے ہیں کہ حدیث مسلم منسوخ نہیں ہے، لیکن باوجود منسوخ نہ

ہونے کے بھی وہ آپ کے لیے قابل احتجاج ومفید نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں حسب تصریح مولانا عبدالحی جن کی مذکورہ بالا تقریر کو آپ تسلیم کر چکے ہیں ارادۂ تاکید کی صورت کا اور اس وقت کا حکم مذکور ہے جب نیت پر حکم مشکل نہ تھا اور عام حالت ایک کے ارادہ کی تھی، اور یہ صورت حضرت عمرؓ ہی کے وقت سے بدل گئی، اور اسی وقت سے نیت پر حکم لگانا مشکل ہو گیا اور عام حالت تینوں کے ارادہ کی ہوگئی، پس موجودہ زمانہ کی تین طلاقوں کا حکم حدیث مسلم میں مذکور ہی نہیں ہے، لہذا ہمارے مقابلہ میں اس کو پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور اگر جواب نفی میں ہے تو جس بات کو آپ خود غلط سمجھتے ہیں اس کو پیش کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر کہئے کہ مولانا کی تقریر الزام کے لیے پیش کی گئی ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس تقریر سے ہم کو الزام دینا سراسر نافہمی و نادانی ہے، اس لیے کہ حدیث مسلم کو جو شخص بھی منسوخ کہتا ہے وہ اس صورت میں منسوخ کہتا ہے جب اس کو حدیث نبوی (مرفوع) مانا جائے اور حکم فاروقی وفتویٰ ابن عباسؓ کو بھی اسی صورت کا حکم فرض کیا جائے جس صورت کا حکم حدیث مسلم میں مذکور ہے، اور اس تقدیر پر مولانا عبدالحی نے حدیث مسلم کے غیر منسوخ ہونے کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر مجیب صاحب سچے ہیں تو اس تقدیر خاص پر مولانا کا حدیث مسلم کو غیر منسوخ کہنا ثابت کریں۔

باقی مولانا کے کلام سے جس تقدیر میں حدیث مسلم کا منسوخ نہ ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس تقدیر میں کوئی شخص بھی نسخ کا دعویٰ نہیں کرتا، اس لیے کہ جب حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ اور حضرت عمرؓ کا حکم حدیث مسلم کے خلاف ہی نہیں ہے، بلکہ حدیث میں دوسری صورت کا حکم اور ابن عباسؓ اور حضرت عمرؓ کا فتویٰ وحکم دوسری صورت میں ہے، اس لیے تعارض نہ رہا، تو نسخ کے دعویٰ کا کیا امکان؟

دوسری یہ بات پوچھتا ہوں کہ مولانا کی عبارت میں کہاں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم میں سیاست کے ساتھ اجتہاد کی چاشنی بھی ملی ہوئی تھی؟ مولانا نے تو بقول آپ کے ان فقہائے احناف کا رد کیا ہے جو حضرت عمرؓ کے حکم کو محض سیاسی کہتے ہیں اور فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ کا حکم محض سیاست پر محمول نہیں ہے۔ اس سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ صرف سیاسی نہیں بلکہ سیاسی واجتہادی دونوں ہیں؟ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ اس میں سیاست کا کوئی دخل نہ ہو، علی ہذا القیاس اجتہادی بھی نہ ہو، بلکہ کسی نص صریح کے ماتحت ہو۔

تیسری بات یہ پوچھتا ہوں کہ مولانا نے جمہور صحابہ کی بقیہ صفحہ ۵ پر

ارشاد الثقلین

بجواب اتحاد الفریقین

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(چھٹی قسط)

ایک خیانت:

شیعہ مصنف نے اس حدیث کے نقل کرنے میں شیعی خصوصیت کا اظہار بھی کیا ہے، کنز العمال میں اس حدیث کو ذکر کر کے لکھا ہے: فیہ صالح بن أبی ألاسود، واہ یعنی اس حدیث کے راویوں میں صالح بن ابی الاسود ہے جو بہت کمزور اور تباہ حال راوی ہے۔ شیعہ مصنف اس فقرہ کو ہضم کر گئے، اس لیے کہ اس فقرہ کو لکھنے کے بعد حدیث مذکور سے اثبات مدعا ممکن ہی نہ تھا۔

اس کے بعد ازالۃ الخفا، مدارج النبوۃ، تاریخ کامل اور تاریخ اعثم کوفی کی عبارتیں شیعہ مصنف نے اپنے مدعا کے ثبوت میں پیش کی ہیں، لیکن ان میں کوئی عبارت ان کے لیے کار آمد نہیں ہے، اعثم کوفی شیعہ ہے اس کے قول سے اہل سنت کو الزام دینا جہالت ہے، اور کامل و ازالۃ الخفا کی عبارتوں میں آں حضرت ﷺ کا کوئی حکم یا وصیت مذکور نہیں ہے، اور مدارج النبوۃ میں صبر کی وصیت ضرور ہے، مگر خلفائے ثلٰثہؓ کا ذکر یا ان کے زمانہ کی تعیین نہیں ہے، بلکہ صرف یہ ہے کہ جب لوگ دنیا کو اختیار کریں تو تم دین کو اختیار کرنا، اور میں خود علماء شیعہ کے اقوال سے ثابت کر چکا ہوں کہ خلفائے ثلٰثہؓ کا دامن دنیا داری کے دھبہ سے پاک وصاف تھا، اور اگر مصنف اتحاد الفریقین اس کو نہ مانیں اور خلفائے ثلٰثہؓ کو (معاذ اللہ) دنیا پرست ہی کہنے پر اصرار کریں، تو ان کو یہ کہنا پڑے گا کہ حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ کی وصیت پر عمل نہیں کیا، اس لیے کہ وہ برابر خلفائے ثلٰثہؓ کے ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے، ان کی تائید و موافقت کرتے رہے، ان سے وظائف حاصل کر کر کے کھاتے اور کھلاتے رہے،

لہذا انھوں نے صبر نہیں کیا اور نہ دنیا کے مقابلہ میں دین کو اختیار کیا۔

اس کے بعد شیعہ مصنف نے صحیح مسلم کی ایک حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے:

''آنحضرت ﷺ کے بعد کچھ ایسے پیشوا ہونے والے تھے جو دین خدا اور سنت رسول ﷺ کے خلاف بدعات کرنے والے تھے اور ان مظالم وحوادث کے زمانہ میں جن لوگوں نے اپنا فرض دریافت کیا ہے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو برابر صبر کا حکم دیا ہے''۔

شیعہ مصنف نے اس حدیث کے نقل کرنے میں بھی شیعوں کی عام عادت کے مطابق خیانت سے پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی ہے، حدیث کا ابتدائی حصہ جس سے پیشینگوئی کے زمانہ کا پتہ چلتا ہے، ہضم کر گئے ہیں اور حدیث کا اخیر حصہ بھی محرف کر ڈالا ہے، اس لیے میں پوری حدیث مع ترجمہ کے لکھتا ہوں:

قال حذيفة بن اليمان: قلت: يا رسول اللّٰه انا كنا بشرٍ فجاء اللّٰه بخير فنحن فيه فهل من وراء هٰذا الخير شر؟ قال: نعم، قلت: هل وراء ذلك الخير شر؟ قال: نعم، قلت: فهل وراء ذلك الشر خير؟ قال: نعم، قلت: كيف؟ قال: تكون بعدى أئمة لا يهتدون بهداى ولا يستنون بسنتى ويقوم فيهم رجال قلوبهم قلوب الشياطين فى جثمان إنس قال: قلت: كيف أصنع يا رسول اللّٰه إن أدركت ذلك؟ قال: تسمع وتطيع وإن ضرب ظهرك وأخذ مالك فاسمع وأطع.

حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ ہم برائی میں تھے پس اللہ بھلائی میں لایا اب ہم اسی بھلائی میں ہیں، تو کیا اس بھلائی کے بعد پھر برائی ہوگی؟ فرمایا ہاں، میں نے کہا پھر اس برائی کے بعد بھلائی ہوگی؟ فرمایا ہاں، میں نے کہا پھر اس برائی کے بعد بھلائی ہوگی؟ فرمایا ہاں، میں نے کہا کیسے؟ فرمایا: میرے بعد کچھ امام ہوں گے جو میری ہدایت کو قبول نہ کریں گے اور میری سنت پر نہ چلیں گے اور انھیں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی کھڑے ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے اور بدن انسانوں کے ہوں گے، میں نے کہا یا رسول اللہ اگر میں یہ زمانہ پاؤں تو کیا کروں؟ فرمایا کہ ان کی باتیں سننا اور ان کے احکام جو شریعت کے ماتحت ہوں ماننا، اگر چہ تم کو مارا جائے اور تمھارا مال چھینا جائے۔

حدیث کا زیر خط حصہ[1] پورا شیعہ مصنف نے حذف کر دیا ہے، اس لیے کہ اس حصہ سے صاف کھل جاتا ہے کہ جس زمانہ کے متعلق حضرت حذیفہؓ کو (بشرطیکہ وہ اس زمانہ میں ہوں) وصیت کی ہے وہ زمانہ خلفائے ثلثہؓ کا نہیں ہے، بلکہ وہ آنحضرت ﷺ کے مدتوں بعد کے ایک دور کے متعلق ہے، چنانچہ صحیح مسلم کے اسی صفحہ ۱۲۷ میں حضرت حذیفہؓ کی یہی حدیث ان کے دوسرے شاگرد کی زبانی پہلے سے زیادہ واضح الفاظ میں مذکور ہے:

فقلت: هل بعد ذلك الشر من خير؟ قال: نعم، وفيه دخن قال: قلت: وما دخنه قال: قوم يستنون بغير سنتي ويهتدون بغير هديي تعرف منهم وتنكر.

حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دوسری دفعہ کہا کہ کیا اس برائی کے بعد بھلائی ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا ہاں لیکن کچھ کدورت ہوگی، میں نے کہا کہ کدورت کیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک قوم ہوگی کہ میری سنت چھوڑ کر دوسرے کی سنت اور میرا طریقہ ترک کر کے دوسرے طریقہ پر چلے گی، تو ان میں بھلائی بھی پائے گا اور بُرائی بھی۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے تیسری دفعہ کہا کہ کیا اس خیر کے بعد پھر شر وفساد ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا ہاں، کچھ پکارنے والے ہوں گے جو گویا جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں، جو ان کی بات مان لے گا اس کو جہنم میں اٹھا کر پھینک دیں گے، میں نے کہا یا رسول اللہ کچھ ان کی صفت بیان کیجئے، آپ نے فرمایا کہ وہ قوم ہمارے سے ہوگی، اور ہماری زبان بولتی ہوگی، میں نے کہا یارسول اللہ اگر میں وہ زمانہ پالوں تو آپ میرے لیے کیا رائے رکھتے ہیں؟ فرمایا مسلمانوں کی جماعت اور ان کے خلیفہ وپیشوا کو نہ چھوڑنا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جاہلیت کے بعد جو نیکی کا دور شروع ہوا ہے اس کے خاتمہ پر برائی کا دور شروع ہوگا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ برائی کا یہ دور کب سے شروع ہوگا اور کب ختم ہوگا، پھر اس کے بعد نیکی کا دور ہوگا، لیکن اس میں کسی قدر برائی کی آمیزش بھی ہوگی اور اسی دوسرے دور میں بعض لوگ خلاف سنت امور کا ارتکاب کریں گے، پھر اس کے بعد تیسرے دور میں جہنم کی طرف بلانے والے پیدا ہوں گے، اسی دور کی نسبت حضرت حذیفہؓ کو وصیت کی گئی ہے۔

(۱) علامہ اعظمیؒ کے مسودے میں کوئی عبارت خط کشیدہ رہی ہوگی، ہمارے سامنے مطبوعہ کتاب ہے، اس میں کوئی خط نہیں ہے، اس لیے مجبوراً یہاں بھی چھوڑ دیا گیا ہے (ادارہ)

پس اگر یہ تیسرا دور آنحضرت ﷺ کی وفات ہی کے وقت سے شروع ہوگیا تھا تو کیا پہلے دو دور آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں گذر گئے تھے؟ اگر شیعہ اثبات میں جواب دیں تو یہ حدیث کے ابتدائی فقرہ کے بالکل خلاف ہے، اس کے علاوہ کوئی مسلمان آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک کو شر وفساد کا گہوارہ قرار دینے کی بے حمیتی نہ قبول کرے گا۔

بہر حال مصنف ''اتحادالفریقین'' نے جو نتیجہ اپنے سوءِ فہم اور اصحاب دشمنی کی بناء پر اس حدیث سے نکالا ہے وہ ہرگز اس حدیث سے نہیں نکلتا، اس حدیث کی صحیح تشریح یہ ہے کہ جاہلیت کے بعد والا دورِ خیر حضرت عثمانؓ تک باقی رہا، اس کے بعد قاتلین عثمان وخوارج اور ابن سبا کے اتباع کا دور آیا اور یہ دورِ شر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اموی کی خلافت سے پہلے ختم ہو گیا، ان کی خلافت سے پھر دورِ خیر شروع ہوا اور اس کا خاتمہ قریطون اور باطنیوں کی اسلام دشمنی سے ہوا، اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت حذیفہؓ کی ایک حدیث میں جو بخاری ومسلم میں ہے صراحۃً مذکور ہے کہ اسلام میں حضرت عمرؓ کے عہد مبارک تک فتنہ وفساد کا احتمال نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ مسلم کی حدیث مذکورۂ بالا میں جس پیشین گوئی کا ذکر ہے وہ عہد خلفائے ثلٰثہؓ کے بہت بعد کے زمانہ سے متعلق ہے۔

اسی سلسلہ میں مصنف اتحادالفریقین نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مقدس ہستی پر تعریضاً نہایت سخت کمینہ حملہ کیا ہے، میں اس کا بدلہ لینا نہیں چاہتا، اللہ تعالیٰ منتقم حقیقی ہے۔

تقیہ کا جواز:

اسی حدیث سے تقیہ کا جواز بھی ثابت کیا ہے، وہ بہت پُر لطف ہے، لکھتے ہیں: اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے سخت مصائب کے وقت میں جب کہ کسی جابر وظالم وبے دین کی طرف سے خلاف دین خدا وسنت رسول احکام کی پابندی عائد کی جائے تو ان احکام کو تسلیم کر لینا چاہئے اور اس کی اطاعت کرنا اپنا فرض سمجھنا چاہئے، یہی وہ مسئلہ ہے جس کو اہل تشیع تقیہ کہتے ہیں (صفحہ ۳۵)

شیعہ مصنف نے یہ نتیجہ حدیث مسلم کے آخری فقرہ **تسمع وتطيع وإن ضرب ظهرك وأخذ مالك فاسمع وأطع** (یعنی اگر تم کو زدوکوب کیا جائے اور تمھارا مال چھین لیا جائے تب بھی تم بات سننا اور حکم ماننا) سے نکالا ہے، مثل مشہور ہے کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر

آتا ہے، بھلا اس فقرہ کو تقیہ سے کیا تعلق؟ تقیہ تو پٹنے اور بے آبروئی سے بچنے کے لیے ہوتا ہے (جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں، اور یہاں پٹنے اور مال لٹنے پر بھی سمع وطاعت کا حکم دیا جارہا ہے، پس جب پٹ ہی گئے اور مال لٹ ہی گیا تو اب تقیہ کیسا اور اس سے کیا فائدہ؟

سمع وطاعت کا صحیح مطلب:

حقیقت یہ ہے کہ مصنف ''اتحاد الفریقین'' کو سمع وطاعت کا مطلب معلوم نہیں، اس لیے ان سے یہ خلاف دانشمندی حرکت سرزد ہوگئی، اگر اور کچھ نہیں تو صحیح مسلم کو صفحہ ۱۲۷ کے ایک ورق پہلے سے پڑھ لیتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ احادیث کثیرۂ متواترۃ المعنی میں آنحضرت ﷺ نے جو سمع وطاعت کا حکم دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر یا خلیفہ یا حاکم جب تک خلاف شرع بات اور معصیت کا حکم نہ دے تب تک اس کا حکم ماننا رعیت پر فرض ہے اور اس کی فرمانبرداری واجب، چاہے وہ بدعمل و بدکار ہی کیوں نہ ہو، اور اس کی بدکاری اور بے عملی کی وجہ سے جب کہ وہ لوگوں کو برائی پر مجبور نہیں کرتا اور خلاف شرع احکام نافذ نہیں کرتا، اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا جائز نہیں ہے، سمع وطاعت سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر امیر وحاکم خلاف شریعت بھی کہے تو اس کو مان لو، سمع وطاعت کا یہ مطلب قرار دینا، حد درجہ بے ایمانی وخیانت ہے، صحیح مسلم صفحہ ۱۲۵ میں متعدد احادیث اس خیانت کی پردہ دری کر رہی ہیں:

(۱) على المرء المسلم السمع والطاعة فيما أحب وكره إلا أن يومر بمعصية فإن أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة

مرد مسلم پر سمع وطاعت لازم ہے چاہے اسے طبعاً پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ مگر یہ کہ معصیت کا حکم دیا جائے پس اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو اس کا نہ سننا جائز نہ ماننا۔

۲:- حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے راوی ہیں:

لا طاعة في معصية الله إنما الطاعة في المعروف.

یعنی اللہ کی نافرمانی میں کسی کی فرماں برداری جائز نہیں، فرماں برداری تو صرف نیکی میں کی جاتی ہے۔

۳:- حضرت عبادہ بن صامتؓ آنحضرت ﷺ سے ناقل ہیں:

ولا ننازع الأمر أهله قال إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه بُرهان.

یعنی آنحضرت ﷺ نے وصیت کی کہ ہم امراء وحکام سے امارت وحکومت کے لیے جھگڑا نہ کریں مگر یہ کہ

امرا کی طرف کھلا ہوا کفر رونما ہو۔

۴:-حضرت عبادہؓ کی دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہ وصیت بھی کی ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں حق بات کہنے سے باز نہ رہیں اور کسی سرزنش کی پروا نہ کریں۔

ان احادیث نبویہ سے ثابت ہوگیا کہ خلاف شرع احکام کو ماننا، اور تسلیم کرنا جس کو شیعہ مصنف نے تقیہ کہا ہے، قطعاً حرام ہے اور سمع وطاعت کا ہرگز وہ مطلب نہیں جو شیعہ مصنف نے بیان کیا ہے۔

ایک اور خیانت:

پھر یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ شیعہ مصنف نے تقیہ کے معنی بیان کرنے میں انتہائی بخل سے کام لیا ہے، اس لیے [کہ] مذہب شیعہ کے رازہائے سربستہ سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ تقیہ کا مفہوم اپنے اندر اس سے بہت زیادہ وسعت رکھتا ہے، یعنی مذہب شیعہ کی رو سے تقیہ صرف افعال واعمال میں نہیں، بلکہ اقوال میں بھی ہوتا ہے اور امرا وحکام کے ڈر سے یا ان کے مجبور کرنے ہی سے نہیں، بلکہ بغیر کسی خوف کے اور بلا مجبوری کے بھی جائز ہے، حد ہوگئی کہ شیعہ حضرات نے اس کی بھی تشریح کی ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں جب کہ خود حاکم تھے، صدہا خلاف شریعت امور کیے، اور ان کے بجالانے کا حکم دیا اور شیعوں نے اس کی بھی تشریح کردی ہے کہ اگر حاکم شیعوں کو مذہبی آزادی بھی دے دے تو بھی وہ تقیہ کر سکتے ہیں (یعنی خلاف شرع کام کر سکتے ہیں اور خلاف واقع یعنی جھوٹ بول سکتے ہیں) شیعوں کی سب سے زیادہ مستند کتاب کافی وغیرہ میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں، پس تقیہ کے ایسے وسیع مفہوم کو اتنا محدود یعنی یہ کہ کسی ظالم بادشاہ کے خلافِ شرع جابرانہ احکام کو ماننا، بتانا کھلا ہوا فریب ہے اور اس سے مذہب شیعہ کے عیوب کی پردہ پوشی کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہے۔

ہمارے اس پورے بیان سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ شیعہ حضرات خلفاء ثلثہؓ سے حضرت علیؓ کے جنگ نہ کرنے کی یہ وجہ جو بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو صبر کی وصیت کی تھی، اس کی کوئی تائید ہماری کتابوں سے نہیں ہوتی، اصول کافی صفحہ ۱۷۳ میں جن الفاظ میں اس وصیت کا ذکر ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اے علیؓ اس کے ساتھ تم کو صبر بھی لازم ہے، اپنے غصہ کو ضبط کرنا، اپنی حق تلفی پر اور اپنے خمس کے غصب ہو جانے پر اور اپنی آبروریزی پر، حضرت علیؓ نے کہا ہاں میں نے قبول کیا اور راضی ہو گیا، اگر چہ میری بے عزتی کی جائے اور احکام دین معطل کر دیئے جائیں اور قرآن پھاڑ ڈالا جائے اور کعبہ گرا دیا جائے اور میری ڈاڑھی میرے سر کے تازہ خون سے رنگین کر دی جائے، ہمیشہ صبر کروں گا، یہاں تک کہ آپ کے پاس پہنچ جاؤں (مر جاؤں)۔''

ناظرین اس وصیت اور کنز العمال کی حدیث کو ایک ساتھ پڑھ کر دیکھیں کہ ان دونوں میں کوئی دور کا بھی لگاؤ ہے؟ پھر یہ سوچیں کہ ایسی لغو اور بیہودہ وصیت کہ چاہے قرآن نابود کر دیا جائے اور کعبہ گرا دیا جائے مگر اے علیؓ تم کچھ نہ بولنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیسے کر سکتے تھے؟ غور تو کرو کہ قرآن جو اصل مدار دین ہے اور کعبہ جو قبلۂ اسلام ہے، جب یہی دونوں مٹ جائیں گے تو حضرت علیؓ یا کوئی دوسرا مسلمان زندہ رہ کے کیا کرے گا، پس یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس حالت میں صبر کی اور تلوار نہ اٹھانے کی تلقین فرمائیں۔

''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں اس وصیت پر یہی اعتراض کیا گیا ہے اس کا کوئی جواب شیعہ مصنف نے نہیں دیا۔

وجہ دوم:

خلفائے ثلثہؓ سے جنگ نہ کرنے کی دوسری وجہ شیعہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو یہ ڈر تھا کہ جنگ کرنے کی وجہ سے لوگ مرتد ہو جائیں گے، لیکن حضرات شیعہ وجہ بیان کرتے وقت غایت سفاہت سے یہ نہیں سوچتے کہ جب بہ تصریح ائمۂ شیعہ تمام صحابہؓ باستثنائے چہار اشخاص وفات رسول کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے، تو اب حضرت علیؓ کو کیا اندیشہ تھا؟ کسی ناشدنی کے ہو جانے کے بعد اس کے اندیشہ سے کوئی ضروری کام چھوڑ دینا کس عقل کا تقاضا ہے؟ پھر یہ بھی نہیں سوچتے کہ حضرت ابوبکرؓ سے لڑنے کی وجہ سے تمام مسلمان کیوں مرتد ہو جاتے؟ آخر ان دونوں باتوں میں کیا علاقہ ہے؟ پھر یہ بھی بتانا چاہئے کہ خلفائے ثلثہ ہی سے جنگ کرنے میں یہ اندیشہ کیوں تھا؟ صفین اور جمل کی لڑائیوں کے وقت یہ خطرہ حضرت علیؓ کے دل میں کیوں نہیں گذرا؟ مصنف اتحاد الفریقین نے ان باتوں کا تو کوئی جواب نہیں دیا، وہی رٹا رٹایا ہوا سبق دہرایا کہ حضرت علیؓ نے ارتداد کے اندیشہ سے جنگ نہیں کی اور اس کے ثبوت میں ایک بے جوڑ عبارت نقل کر دی جس سے اولاً تو اس مدعا کا ثبوت ہی دشوار ہے، اور اگر بالفرض وہ عبارت مثبت مدعا بھی ہو تو جب تک کہ مذکورۂ بالا باتوں کا تشفی بخش جواب نہ دیا

جائے، اس وقت اس وجہ کو کون مان سکتا ہے اور کس کو اس کی لغویت میں شبہہ ہوسکتا ہے۔

استیعاب کی جو عبارت مصنف اتحاد نے نقل کی ہے، اولاً تو ایسی بے سند روایتیں قابل سماعت نہیں۔

ثانیاً:- اس میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں کہ مسلمانوں کے مرتد ہوجانے کے اندیشہ سے میں نے جنگ نہیں کی، بلکہ اس میں صرف یہ ہے کہ اگر تفرقہ کا ڈر اور یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ کفر لوٹ آئے گا اور دین برباد ہوجائے گا تو ہم بدل دیتے۔

حضرت علیؓ کا یہ مقصود ہے کہ اگر میں خلیفہ بدلنے کی کوشش کرتا تو تفرقہ بڑھ جاتا، اور ایام جاہلیت کے جنگ وجدال کا قصہ از سر نو تازہ ہوجاتا اور میرا دین برباد ہوتا اس لیے میں نے صبر کیا، اس کے بعد فرماتے ہیں **ثم لم نر بحمدالله إلا خیراً** یعنی پھر اس کے بعد ہم نے خدا کا شکر ہے، کوئی برائی خلفا کے وقت میں نہیں دیکھی، ہر نوع سے خیر وخوبی ہی نظر آئی، مصنف اتحاد نے غایت دیانت داری سے حضرت علیؓ کا یہ فقرہ نقل نہیں کیا۔

ایک لطیفہ:

حضرت علیؓ کے اس کلام میں ایک فقرہ ہے **فأبی علینا قومنا** اس کا ترجمہ مصنف اتحاد نے یہ کیا ہے: ''مگر قوم نے ہماری مخالفت کی''

لیکن آگے چل کر ایک حدیث میں **قومک** کا جو ترجمہ انھوں نے کیا ہے اس کے لحاظ سے یہاں کا ترجمہ بالکل غلط ہے، اس ترجمہ کی مناسبت سے یہاں یوں ہونا چاہئے کہ:

''مگر خود ہمارے ہی قوم نے ہماری مخالفت کی''

جہالت و بے دماغی کی بدترین مثال:

حضرت علیؓ کے جنگ نہ کرنے کی یہ وجہ بیان کرنا ہی کیا کم حماقت تھی، مگر بعض ایمان فروش وعبائے جہالت بدوش اشخاص نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اس کو آں حضرت ﷺ کے منافقین عہد نبویؐ کو قتل نہ کرنے سے تشبیہ دے کر یہ بھی لکھ ڈالا کہ حضرت علیؓ کا ارتداد کے اندیشہ سے جنگ نہ کرنا ایسا ہی تھا، جیسا کہ رسول خدا ﷺ نے ارتداد کے خوف سے منافقین کو قتل نہیں کیا۔ جہالت کا اس سے بدتر نمونہ آپ نے دیکھا ہے؟ ان عقل کے پتلوں سے پوچھئے کہ منافقین کے مقتول ہوجانے کے بعد ارتداد کا اندیشہ کیسا؟ اب تک دنیا یہی

جانتی تھی کہ آدمی کی زندگی ہی تک اس کے مرتد ہونے کا امکان ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ شیعوں کے ہاں مرنے کے بعد بھی مرتد ہوجایا کرتے ہیں، پھر یہ بھی پوچھئے کہ ارتداد کا امکان تو مومن ہونے کے بعد ہوتا ہے، منافقین مومن تھے ہی کب جوان کے مرتد ہونے کا اندیشہ پیدا ہو، منافقین کے مومن نہ ہونے کی تصریح قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے، پھر یہ بھی پوچھئے کہ جن عبارتوں سے وہ استدلال کرتے ہیں ان میں یہ کہاں مذکور ہے کہ ارتداد کے اندیشہ سے ان کو قتل نہیں کیا گیا، ان میں تو یہ مذکور ہے کہ مانوس بنانے کی مصلحت سے ان کو قتل نہیں کرتے تھے، یعنی آنحضرت ﷺ کا خیال شریف یہ تھا کہ اگر ان کے ساتھ سختی نہ کی جائے اور ان کے ساتھ عفو وکرم، احسان ونرمی کا سلوک کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ یہ مومن ہوجائیں۔

اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ قیاس ہی بالکل فاسد ہے، کہاں منافقین عہد نبویؐ اور کہاں خلفائے ثلثہؓ؟ شیعہ اس کا انکار نہیں کرسکتے کہ منافقین میں سے نہ کوئی قاضی تھا نہ حاکم، نہ موذن نہ امام، نہ مدرس نہ مفتی، نہ امیر لشکر نہ صوبہ دار، غرض یہ کہ نہ ان کو مذہبی پیشوائی حاصل اور نہ حکومت کے کسی شعبہ کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی، اس کے علاوہ ہر شخص ان کو بے دین و بے ایمان جانتا تھا، اس لیے ان کی وجہ سے مذہب میں کسی غلط عقیدہ یا عمل کے رائج ہونے کا کوئی اندیشہ نہ تھا، برخلاف خلفائے ثلثہؓ اور ان کے ہمنواؤں کے کہ حکومت ان کے ہاتھ میں تھی، قاضی وہ تھے، موذن وامام ان کا تھا، درس وافتا کی خدمت ان کے سپرد تھی، امیر لشکر وہ تھے، بلاد اسلامیہ کے تمام صوبوں پر ان کا تسلط تھا، اور شیعوں کے عقائد کی رو سے یہ سب کے سب ایمان کے ایک رکن اور دین محمدیؐ کی ایک اصل امامت کے منکر تھے، قرآن میں علانیہ تمام ممکن تحریفیں کررہے تھے، شریعت اسلامیہ کی عظیم الشان عبادتوں کو حکماً روک رہے تھے (جیسے متعہ) دین میں بڑی بڑی بدعتیں جاری کررہے تھے (جیسے تراویح) حرم اہل بیت رسول (ﷺ) کی بے حرمتی و بے عزتی ان کا شعار تھا، جیسے واقعۂ ام کلثوم بروایت امام جعفر صادق۔ مختصر یہ کہ شیعوں کے نقطۂ نظر سے ان لوگوں کے ہاتھوں اسلام برباد ہورہا تھا، دین محمدی کی اصلی تعلیمات مٹ رہی تھیں اور ان کی جگہ پر غلط عقائد، بے اصل خیالات اور بے سروپا تعلیمات کی اشاعت ہورہی تھی، اور حضرت علیؓ یا ان کے پانچ سات رفقا کے علاوہ سارا عالم اسلامی ان تمام کارروائیوں کو اسلام کی عین خدمت جانتا تھا، پس اس عظیم الشان فرق کو نظر انداز کرکے موخر الذکر جماعۃ کو اول الذکر پر قیاس کرنا سخت بے عقلی ہے، اور اگر شیعوں کا خیال صحیح ہے تو موخر الذکر جماعت کی حرکات پر خاموش رہنا انتہا درجہ کی بے حمیتی اور بے دینی ہے۔

جاری ہے

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ علی متقی صاحب کنز العمال علی بن حُسام الدین نام تھا، آبائی وطن جونپور ہے، آپ کی پیدائش برہان پور کی ہے، والد نے سات ہی آٹھ سال کی عمر میں آپ کو شاہ باجن چشتی برہانپوری کے ہاتھ پر بیعت کرادی تھی۔ چندد نوں کے بعد باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور کوئی سرپرست نہ ہونے کے سبب لڑکپن لہو ولعب میں گذرا، جوانی کے قریب پہنچے تو کسی بادشاہ کی معیت میں مندو (مانڈو۔ مالوہ) آئے اور کچھ دنیا ہاتھ لگی، مگر یک بیک ایک غیبی کشش سے ان کا دل دنیا سے سرد ہوگیا، اس لیے دنیا کو لات مار کر شاہ باجن کے لڑکے اور جانشین شیخ عبدالحکیم کی صحبت اختیار کی، اور ان کے ہاتھ سے مشائخ چشت کا خرقۂ خلافت زیبِ تن کیا۔

چونکہ عزیمت وتقویٰ ان کے خمیر میں تھا، اس لیے ملتان پہنچ کر شیخ حُسام الدین متقی کی خدمت میں ورع وتقویٰ کی منزلیں طے کیں، ساتھ ہی ساتھ دوسال میں تفسیر بیضاوی اور عین العلم کا مطالعہ بھی ان کی خدمت میں کیا، اس کے بعد توفیق نے یاوری کی اور حجاز پہنچے، حجاز میں شیخ ابوالحسن بکری (جو بالاجماع اپنے زمانہ کے اولیاء میں تھے) کی صحبت اور شاگردی اختیار کی، ان کے علاوہ دوسرے مشائخ سے بھی استفادہ کیا۔

شیخ نے مستقل طور پر مکہ میں اقامت اختیار کرلی، اور بقول محدث دہلوی اپنے عبادت ومجاہدہ کے انوار سے عالم کو منور کیا، اور آپ کے ظاہری و باطنی فیوض سے ساری دنیا مستفید ہوئی۔ طلبہ کی تعلیم، مریدوں کی تربیت اور تصنیف وتالیف کی راہ سے علم اور دین کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں۔

کنز العمال ان کا اتنا بڑا علمی کارنامہ ہے کہ ان کے استاد شیخ ابوالحسن بکری فرمایا کرتے تھے، کہ سیوطی کا احسان سارے عالم پر ہے، مگر سیوطی پر متقی کا احسان ہے کہ ان کی کتاب کو مرتب کر کے

استفادہ آسان کر دیا۔

شیخ ابن حجر مکی بھی آپ کے استاد تھے، اور اپنے زمانہ میں مکہ کے سب سے بڑے عالم وفقیہ تھے، وہ باوجود استاد ہونے کے، علی متقی کی حدیث فہمی وجودتِ استنباط کے اس درجہ قائل تھے کہ کسی حدیث کی مراد سمجھنے میں ان کو دقت ہوتی تو اپنا آدمی بھیج کر علی متقی سے دریافت کراتے تھے کہ اس حدیث کو آپ نے کنز العمال کے کس باب میں رکھا ہے، پھر اس قرینہ سے حدیث کی مراد سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

شیخ ابن حجر سے ابتداءً شیخ علی متقی نے پڑھا تھا، مگر بعد میں شیخ ابن حجر علی الاعلان اپنے کو ان کا حقیقی شاگرد کہتے تھے، بلکہ آخر میں ان کے مرید ہو کر ان کے ہاتھ سے خرقۂ خلافت بھی پہنا۔

مکہ کے دوسرے علماء کبار بھی حدیث دانی میں ان کی نکتہ رسی، ودقیقہ سنجی کے قائل اور بہت مداح تھے، مشائخ وقت ان کے کمال ولایت کے معترف تھے، اور خواص وعوام، جس طرح مشائخ سلف کا نام لیا جاتا ہے، اس طرح تعظیم وتکریم سے ان کا نام لیتے تھے۔

شیخ علی متقی کے تلمیذ ارشد اور خلیفۂ راستیں شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ شیخ جب ملتان سے روانہ ہو کر گجرات پہنچے تو اس وقت گجرات میں سلطان بہادر شاہ گجراتی کی حکومت تھی، سلطان آپ کے اوصاف وکمالات سن کر خواہش مند ہوا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو، آپ نے اس کو منظور نہیں فرمایا۔

آپ کا اس وقت یہ حال تھا کہ جدھر جاتے تھے لوگ پروانہ وار آپ پر ٹوٹے پڑتے تھے، اور آپ حجرہ کا دروازہ بند کر کے یادِ حق میں مشغول رہتے، کسی کو آنے نہیں دیتے تھے۔

اتفاق سے اس وقت قاضی عبداللہ سندی جو بڑے پرہیزگار اور نامی عالم تھے، سند سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے، راستہ میں کچھ دنوں کے لیے گجرات میں ٹھہر گئے تھے۔

قاضی صاحب شیخ علی متقی سے محبت وعقیدت کا نہایت قوی رابطہ رکھتے تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ سلطان بہادر کو حد سے زیادہ شوقِ ملاقات ہے، اور اس کی طلب صادق ہے تو شیخ سے عرض کیا کہ سلطان کی درخواست کو منظور فرما کر ایک بار ملنے کی اجازت دے دی جائے، آپ چاہیں تو اس سے بات بھی نہ کریں، ہم اس کو باتوں میں لگائے رہیں گے، آپ نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ وہ نامشروع لباس پہن کر اور غیر شرعی وضع قطع میں آئے اور میں اس کو اس طرح دیکھ کر خاموش رہوں، امرِ معروف ونہی عن المنکر نہ کروں۔

قاضی صاحب نے کہا کہ حضرت جو چاہیں کہہ سکتے اور کر سکتے ہیں، سلطان کو تو صرف اس کی تمنا ہے کہ ایک بار خدمت اقدس میں حاضری کا شرف اس کو حاصل ہو جائے، اس کے بعد آپ راضی ہوئے، اور سلطان بہادر آیا، شیخ نے جو جو نصیحتیں مناسب اور ضروری سمجھیں سب کیں۔

دوسرے دن سلطان نے گجرات کا ایک کرور تنگہ (جو میرے خیال میں اسی ہزار روپے سے زائد ہوتا ہے) نذرانہ بھجوایا۔ شیخ نے وہ سب اٹھا کر قاضی عبداللہ کو دے دیا اور فرمایا کہ چونکہ اس رقم کے حصول کا واسطہ آپ بنے ہیں اس لیے اس کا تعلق آپ سے ہے۔

شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مکہ کے ایک وزیر نے آپ کی دعوت کے لیے بڑا اصرار کیا اور کہا کہ بندہ کے گھر تک قدم رنجہ فرمائیں تاکہ برکت ہو۔ فرمایا مجھے معذور تصور فرمائیں، میں یہیں سے دعا کروں گا، خدا برکت دے گا، مگر وہ نہیں مانا، تو آپ نے فرمایا کہ اچھا تین شرطوں کے ساتھ منظور ہے، پہلی شرط یہ ہے کہ میری جہاں خواہش ہوگی وہاں بیٹھوں گا، یہ اصرار نہ ہو کہ صدر مقام میں تشریف رکھئے، دوسری یہ کہ مجھ کو جو اچھا لگے گا وہ کھاؤں گا، یہ اصرار نہ ہو کہ یہ نہیں وہ کھایئے، تیسری شرط یہ کہ جب ہمارا جی چاہے گا اٹھ کر چلے آئیں گے، کوئی یہ نہ کہے کہ ذرا دیر اور تشریف رکھیں، وزیر نے سب شرطیں منظور کیں تو وعدہ فرمایا کہ کل آئیں گے۔

دوسرے دن شیخ نے اپنے تھیلے میں جس کو وہ ہر وقت گلے میں لٹکائے رہتے تھے، روٹی کے کچھ ٹکڑے رکھے اور تن تنہا وزیر کے گھر روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر دیکھا تو اس نے ایک شاہانہ مجلس سجائی تھی۔ آپ اس مجلس میں دروازہ کے قریب بیٹھ گئے، اس نے کہا یہاں تشریف رکھئے، فرمایا کہ یہ خلاف شرط ہے، وہ چپ ہو گیا، پھر فرمایا کہ جلدی کرو وقت تنگ ہے، اس نے جلدی سے دسترخوان پر انواع واقسام کے کھانے چُنے، آپ نے تھیلے سے روٹی نکالی اور اسی کو کھایا، وہ بولا، ذرا اس کھانے کو بھی چکھ لیجئے، فرمایا ہم نے تو پہلے ہی شرط کر لی ہے کہ جو مزاج میں آئے گا کھائیں گے، اس کے خلاف اصرار نہ ہو، اس کے بعد اٹھے، اور سلام کر کے روانہ ہو گئے۔

شیخ علی متقی فرماتے تھے کہ جو چیز حلال کمائی سے حاصل ہوئی ہو وہ کبھی ضائع نہ ہوگی، اگر گم

بھی ہوگئی تو پھر مل جائے گی، اس پر اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بار ہم سمندر کے سفر میں کشتی پر سوار تھے، کہ طوفان آ گیا، اور کشتی ٹوٹ گئی، ہم کئی آدمی ایک تختہ پر کئی دنوں کے بعد ساحل پر پہنچے، اب ہم کو پیدل سفر کرنا پڑا، تو بہت سی کتابیں ساتھ تھیں، جن کو لے کر چلنا ممکن نہ تھا، طوفان میں کتابیں بھیگ بھی گئیں تھیں، ہم نے ان سب کتابوں کو عرب کے ریگستان میں دفن کر دیا اور وہاں ایک علامت بنادی۔

جب ہم پیدل چل کر مکہ معظّمہ پہنچے، اور عمرہ کا طواف کر کے سعی سے فارغ ہوئے تو کئی بدو اپنے سروں پر گٹھریاں لادے ہوئے ہمارے سامنے آئے اور کہا یہ کتابیں ہیں، ان کو ہم بیچنا چاہتے ہیں، ہم نے کھلوا کر دیکھا تو وہی ہماری کتابیں تھیں، ہم نے خاموشی سے ان کتابوں کی قیمت بدوؤں کو دے دی اور کتابیں لے لیں۔

کتابوں کے اوراق چپک کر سوکھ گئے تھے، ان کو پھر پانی میں تر کر کے جدا جدا کیا، دیکھا تو ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا تھا۔

شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں کہ آپ کا اکثر وقت علم دین کی خدمت اور اس کے نشر وافادہ اور اہل علم کی امداد واعانت میں صرف ہوتا تھا، آپ اپنے ہاتھ سے سیاہی تیار کر کے کتابیں نقل کرنے کے لیے طالب علموں کو دیا کرتے تھے، اور جو جو کم یاب ومفید کتابیں عرب میں دستیاب ہوتی تھیں، ان کی کئی کئی نقلیں کرا کے لوگوں کو دیا کرتے تھے، اور دوسرے ملکوں میں جہاں وہ ناپید تھیں بھجوایا کرتے تھے۔

کھانا برائے نام کھاتے تھے، تھوڑا سا شوربا جس کی مقدار چند تولوں سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، اسی کے چند چمچے آپ لیتے تھے، اور باقی لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں کہ جوانی میں نفلیں بہت پڑھتے تھے، آخر عمر میں ذکر خفی، تفکر اور تصنیف علوم دین ان کی عبادت تھی، پھر بھی بڑھاپے کی کمزوری، اور ضعف مثانہ کی وجہ سے رات میں دس بارہ دفعہ پیشاب کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، اور ہر دفعہ وضو کر کے دو یا چار یا زیادہ رکعتیں نفل کی پڑھا کرتے تھے۔

ابتدا میں جب قوت تھی تو کتابت ذریعۂ معاش تھی، بعد میں بیواؤں سے قرض لے کر کام چلاتے تھے، اور جب کہیں سے فتوح حاصل ہوتی تو قرض ادا کر دیتے تھے، کبھی کبھی اس نذرانہ کو بھی

اپنے مصرف میں لاتے تھے، جس کی نسبت ظن غالب ہوتا تھا کہ یہ حلال کمائی کا ہے۔

بزرگوں کا دھوم دھام سے عرس کرنے کے بجائے، یہ اندازہ لگا کر کہ کھانے میں کتنا خرچ ہوگا، اتنی رقم محتاجوں اور فقیروں کو خفیہ طریقہ سے دیدیتے تھے، اور فرماتے کہ کھانے کی مجلس ترتیب دینا، اور عوام کی بھیڑ جمع کرنا تکلف اور تشویش سے خالی نہیں ہے۔

شیخ علی متقی سلطان محمود گجراتی صغیر کے عہد سلطنت میں دوبار مکہ سے گجرات آئے ہیں، بادشاہ اکثر وبیشتر آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا، مگر چونکہ نامشروع لباس اس کے جسم پر ہوتا تھا، اس لیے آپ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے، اور قطعاً التفات نہیں فرماتے تھے، تا آنکہ ایک دن وہ صلحاء کا لباس پہن کر آیا، اُس دن آپ نے رضا مندی کی نگاہ سے اس کو دیکھا۔

اُس نے موقع مناسب سمجھ کر درخواست کی کہ آج حضرت ''فقیر'' کے گھر تشریف لے چلیں، آپ نے منظور فرمایا، تو سلطان محمود نے شیخ کے چوڈول کو خود کاندھا دیا اور اپنے گھر لایا۔

آصفی نے لکھا ہے کہ ان کی اعلیٰ ترین منقبت یہ ہے کہ ان کے شاگرد وخلیفہ شیخ حسام الدین کو ایک دن خواب میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، تو انھوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ اس وقت سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا کہ تمھارے شیخ، پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا محمد بن طاہر ہندوستان میں۔

شیخ عبدالحق کا بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے، شیخ کا بیان مولانا محمد طاہر کے حال میں آئے گا۔

یہ تذکرہ بہت طویل ہوگیا، پھر بھی ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا، شیخ کے اجمالی حالات میں ان کے تلمیذ رشید شیخ حسام الدین متقی نے ایک رسالہ بنام **اتحاف التقی فی فضل الشیخ علی المتقی** لکھا ہے، ایک اور رسالہ علامہ عبدالقادر بن احمد فاکہی نے بھی لکھا ہے جس کا نام **القول النقی فی مناقب المتقی** ہے، اس میں ان کی سیرت اور ریاضت ومجاہدہ کا ذکر تفصیل سے ہے۔

فاکہی نے لکھا ہے کہ ہمارے شیخ علی متقی سے اس زمانہ کے عرفاء اور علماء میں جو بھی ملا ہے مثلاً شیخ ابوالحسن بکری، شیخ وجیہ عمودی، ابن حجر مکی، شمس الدین رملی، اور شمس الدین بکری سب نے ان کی بے حد تعریف کی ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی زاد المتقین [1] اور اخبار الاخیار میں آپ کے

---

(۱) اس کا قلمی نسخہ احقر کے پاس موجود ہے۔

حالات کچھ شرح وبسط سے لکھے ہیں۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی جب ۹۴۷ھ میں حج کے لیے گئے ہیں تو اس سال انھوں نے شیخ علی کی ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا ہے، اور طبقات شعرانی میں بضمن اولیاء کرام آپ کا ذکر کیا ہے۔

شعرانی فرماتے ہیں کہ میں بار باران کے پاس گیا ہوں، اور وہ بھی کئی دفعہ میری قیام گاہ پر آئے ہیں، وہ زاہد ومتقی عالم تھے، بہت نحیف تھے، جسم پر گوشت برائے نام معلوم ہوتا تھا، اکثر خاموش اور گوشہ نشیں رہتے تھے، گھر سے جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے نکلتے تھے، اور کہیں کنارے ہی پڑھ کر جلدی سے گھر واپس ہوجاتے تھے، شعرانی فرماتے ہیں وہ مجھے اپنے گھر میں لے گئے تھے، میں نے ان کی قیام گاہ کے آس پاس چند چھپروں میں سچے درویشوں کی ایک جماعت کو تلاوت یا ذکر یا مراقبہ یا مطالعہ میں مشغول پایا۔

فرماتے ہیں کہ مکہ معظّمہ میں ان کے جیسا کوئی دوسرا مجھ کو نہیں بھایا۔ فرماتے ہیں کہ انھوں نے مجھے چاندی کے دو چھوٹے سکے بھی یہ کہہ کر عنایت فرمائے کہ اس شہر میں معذرت کے ساتھ یہ پیش کر رہا ہوں۔ شعرانی کہتے ہیں کہ ان سکوں کی برکت سے مجھے خدا نے بڑی کشائش عطا فرمائی، اور میں نے اتنی زیادہ رقم وہاں خرچ کی جس کا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا۔

حضرت شیخ علی متقی کی وفات ۹۷۵ھ میں ہوئی۔

میاں محمد طاہر پٹنی | گجرات کے شہر پٹن کے رہنے والے تھے، قومیت کے لحاظ سے بوہرے تھے، ۹۱۳ھ میں پیدا ہوئے، بلوغ کی عمر سے پہلے قرآن پاک کے حافظ ہوئے، اس کے بعد پندرہ برس تک اپنے دیار کے علماء واساتذہ کے پاس رہ کر متعدد علوم وفنون میں مہارت پیدا کی، اس کے بعد ۹۴۴ھ میں حرمین شریفین کی زیارت کے شوق میں گھر سے نکلے اور حج وزیارت سے فارغ ہوکر ایک مدت تک اس سرزمین میں قیام کیا۔

شیخ ابوالحسن بکری، شیخ ابن حجر مکی، شیخ علی بن عراق، شیخ جاراللہ بن فہد، اور شیخ برخوردار سندی وغیرہم سے علم حدیث وغیرہ میں استفادہ کیا، خصوصیت کے ساتھ شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کی، اور مرید ہوکر استفادۂ علمِ ظاہر کے ساتھ باطنی فیوض سے مالا مال ہوئے۔

حجاز سے واپس آکر ان بدعات کا قلع قمع کیا جو ان کی قوم میں رائج تھیں، اور اپنی قوم کی سُنی

جماعت اور بدعتی جماعت میں امتیاز پیدا کر دیا۔ آپ نے علم حدیث میں کئی مفید کتابیں تالیف فرمائی ہیں، ان میں سب سے بہتر، اور اس فن کی دوسری بہت سی کتابوں سے فائق کتاب ''مجمع البحار'' ہے، وہ بظاہر لغت حدیث کی کتاب ہے، مگر درحقیقت اس کو پوری صحاح ستہ کی شرح و توضیح کہنا چاہیئے۔ دوسری مفید کتاب ''المغنی'' ہے، جس میں راویوں کے ناموں اور نسبتوں کو ضبط کیا ہے۔

یہ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں، مگر اب دونوں کمیاب بلکہ تقریباً نایاب ہیں، ہندوستان کے اہل ہمت و خیر کا فرض ہے کہ اپنے ملک کی اس بے نظیر علمی خدمت کی قدر کریں، اور از سرنو پورے اہتمام سے ان کی تصحیح کرا کے شائع کریں۔ تاکہ ہر ملک کے اہل علم، اس گوہر گراں مایہ سے اپنے جیب و دامن بھر سکیں۔ (۱)

شیخ محمد طاہر نے اپنی کتابوں کے دیباچہ میں شیخ علی متقی کی بہت مدح وثنا کی ہے، ان کو ان کے شیخ نے وصیت کی تھی کہ طالب علموں کے واسطے سیاہی بنایا کریں، اس لیے ان کا معمول تھا کہ سبق پڑھانے کے وقت بھی سیاہی رگڑا کرتے تھے۔

شیخ محمد طاہر نے عہد کیا تھا کہ جب تک مہدویت کے فتنہ سے گجرات پاک نہ ہوگا اس وقت تک وہ اپنے سر پر عمامہ نہ باندھیں گے، جب ۹۸۰ھ میں اکبر نے گجرات فتح کیا اور وہ شیخ سے ملا تو اس نے اپنے ہاتھ سے شیخ کے سر پر عمامہ باندھ دیا، اور کہا کہ دین کی مدد اور بدعتیوں کی سرکوبی کے ہم ذمہ دار ہیں۔

چنانچہ اس نے مرزا عزیز کوکا کو گجرات کا گورنر مقرر کیا، اس نے شیخ کی حمایت کی اور شیخ نے جس قدر ہو سکا بدعات کا استیصال کیا، اس کے بعد مرزا عزیز کی معزولی کا پروانہ آ گیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خانخاناں گورنر ہوا، تو مہدویوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ اپنے گوشوں سے نکل پڑے۔

شیخ نے یہ رنگ دیکھ کر اپنا عمامہ اتار دیا اور اکبر سے ملنے کے لیے آگرہ روانہ ہوئے، شیخ کے تعاقب میں کچھ مہدوی بھی روانہ ہوئے، اور انھوں نے اجین کے قریب پہنچ کر شیخ کو شہید کر ڈالا، یہ ۹۸۹ھ کا واقعہ ہے، شیخ کی نعش، پٹن لائی گئی، اور وہیں دفن کی گئی۔ (۲)

---

(۱) بڑی خوشی کی بات ہے کہ مؤلف کے ہم وطن بعض حوصلہ مند تجار جن کا جدہ میں قیام ہے، اس کتاب کو ٹائپ میں چھپوا رہے ہیں، اس حقیر نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے، اور بڑی حد تک تصحیح بھی کی ہے ۱۲

(۲) میں نے پٹن میں مولانا طاہر کے مزار کی زیارت کی ہے ۱۲

حضرت شیخ علی متقی کے ذکر میں آپ شیخ حسام الدین متقی کا خواب پڑھ چکے ہیں، اس خواب کا ذکر شیخ عبدالحق دہلوی نے بھی ''اخبار الاخیار'' میں کیا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ شیخ حسام الدین کا بیان ہے کہ مجھ کو ایک بار آنحضرت ﷺ کی زیارت خواب میں حاصل ہوئی، میں نے سوال کیا کہ **یا رسول اللّٰہ من افضل الناس فی ھذا الزمان** (اس زمانہ میں سب سے افضل شخص کون ہے؟) فرمایا: **افضل الناس میان غیاث، ثم شیخک، ثم محمد طاھر** (سب سے افضل میاں غیاث ہیں، پھر تمھارے پیر، پھر محمد طاہر)

اس خواب سے شیخ محمد طاہر کی عظمت کا اندازہ کیجیے۔ میاں محمد غیاث سورت کے قریب بھڑوچ کے رہنے والے ایک بزرگ تھے، بڑے عالم، و متقی اور متبع سنت تھے۔

شیخ رحمت اللہ سندی شیخ رحمت اللہ، قاضی عبداللہ سندی کے صاحبزادہ تھے، شیخ علی متقی کے ذکر میں ہم بتا چکے ہیں کہ قاضی عبداللہ سند سے اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ روانہ ہوئے تو چند دنوں تک انھوں نے احمد آباد (گجرات) میں قیام کیا، اسی زمانہ میں حضرت شیخ علی متقی بھی حجاز کے ارادہ سے گجرات پہنچے تھے، قاضی صاحب نے شیخ کی صحبت اختیار کر لی تھی، اور شیخ ہی کے طفیل میں قاضی صاحب کے مصارف سفر بلکہ قیام مدینہ کے مصارف کا بھی انتظام ہو گیا تھا۔

اس سفر میں شیخ رحمت اللہ بھی ساتھ تھے، حجاز پہنچ کر شیخ رحمت اللہ نے حضرت شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کی، اور ان کی خدمت میں ظاہری و باطنی کمالات کا اکتساب کیا، مدینہ میں شیخ علی ابن عراق صاحب ''تنزیہ الشریعۃ'' سے حدیث کا علم حاصل کیا۔

قاضی عبداللہ کے رفقائے سفر میں ایک بزرگ شیخ عبداللہ تھے، انھوں نے شیخ علی متقی کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلوک کی منزلیں طے کی تھیں، شیخ علی متقی کے فیض صحبت سے یہ دونوں بزرگ (شیخ رحمت اللہ اور شیخ عبداللہ) تقویٰ کے ایسے اونچے مقام پر پہنچ گئے تھے، کہ ٹرکی کی حکومت کے حکام جو شیخ کے بے حد معتقد تھے، جب مکہ آتے تو شیخ اپنے اکثر مریدوں اور شاگردوں کے گذارے کے لیے وظیفے مقرر کرا دیتے تھے، مگر شیخ رحمت اللہ و شیخ عبداللہ اور شیخ عبدالوہاب کے لیے وظیفہ قبول نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ وہ رقم شبہہ سے خالی نہیں ہوتی تھی۔

یہ دونوں بزرگ مدتوں اس دیار پاک میں درس و عبادت میں مشغول رہے، تقریباً ۹۷۷ھ

میں بعض مجبوریوں کی بنا پر احمد آباد آکر قیام کیا، آخر عمر میں مریض ہوئے، اور اسی حالت میں حجاز روانہ ہو گئے، مکہ معظمہ پہنچ کر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۹۹۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

خواجہ عبد الشہید عبید اللٰہی ان دونوں بزرگوں کی نسبت فرماتے تھے ان شیخین کو دیکھ کر وہ شیخین (حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم) یاد آجاتے ہیں۔

شیخ رحمت اللہ سندی نے مناسک حج میں دو رسالے لکھے ہیں، بڑے کا نام ''جمع المناسک و نفع الناسک'' ہے، اسی کو ''المناسک الکبیر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کا بہترین قلمی نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں ناچیز نے دیکھا ہے، یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں قسطنطنیہ میں چھپ بھی چکی ہے، مطبوعہ نسخہ میرے پاس موجود ہے، جو مولانا عبداللہ زمزمی مرحوم کا ہدیہ اور ان کی بے پایاں محبت کی ایک یادگار ہے، اس کے ساتھ شیخ احمد کشمخانوی کا رسالہ ''جامع المناسک'' بھی طبع ہوا ہے۔

شیخ رحمت اللہ نے ''جمع المناسک'' کو پھر مختصر کیا ہے، اور اس کا نام ''لباب المناسک'' رکھا ہے، اس کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے، جس کا نام المسلک المتقسط [1] ہے، یہ شرح بھی طبع ہو چکی ہے۔

تنبیہ اول: — ابن العماد حنبلی نے شذرات جلد ہشتم میں اس نام کے دو بزرگوں کا ذکر کیا ہے، ایک کا ذکر شیخ رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ کے عنوان سے ہے، اور سن وفات ۹۷۸ھ، دوسرے کا ذکر شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ کے عنوان سے ہے اور ان کا سن وفات ۹۹۳ بتایا ہے۔

ہم یہاں جن [بزرگ] [2] کا ذکر کر رہے ہیں وہ یہی دوسرے بزرگ ہیں اور وہ حسب تصریح شیخ عبد الحق قاضی عبداللہ سندی کے صاحبزادہ ہیں۔

تنبیہ دوم: — شیخ عبد القادر عیدروس نے ''جمع المناسک و نفع الناسک'' کو شیخ عبداللہ بن سعد اللہ کی تصنیف قرار دیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، جیسا کہ ''جمع المناسک'' کے دیباچہ سے ظاہر ہے۔

''جمع المناسک'' کے باب میں شیخ علی متقی فرمایا کرتے تھے، ''در مناسک حج بے عدیل و بے نظیر واقع شدہ است'' (زاد المتقین ص ۲۵ قلمی)

---

(۱) اعیان الحجاج کے مطبوعہ نسخہ میں المتقسط کا لفظ نہیں ہے، صرف ''المسلک'' ہے، اس کے بعد ایک لفظ کے بقدر بیاض ہے، حضرت محدث الاعظمیؒ کے مسودہ میں ''المتقسط'' بھی ہے۔ اس سے یہاں بڑھایا گیا ہے۔ (مسعود)

(۲) مطبوعہ میں یہاں بھی بیاض ہے، مسودہ سے اضافہ کیا گیا ہے (مسعود)

امام اعظم ابوحنیفہؒ
محدثین ومعاصرین کی نظر میں
اوران کے فقہی اجتہاد پرعمل کرنے والے ان کے معاصر محدثین

از: مسعود احمد الاعظمی

نہ صرف تاریخ اسلام، بلکہ تاریخ انسانی کی مقبول ترین، مشہور ونامور اور عظیم المرتبت ہستیوں کو اگر شمار کیا جائے، تو چند نمایاں ناموں میں ایک، اسلامی تاریخ کی بارہ سو سالہ مدت کے دوران ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے طبقہ کے مقتدا و پیشوا، اور سواد اعظم کے متبوع برحق امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالی علیہ وقدس سرہ العزیز کا نام ہوگا، جو اپنے علم ومعرفت، عقل ودانش، فہم وبصیرت، فقہ واجتہاد، زہد وتقویٰ، عبادت گزاری، پرہیز گاری، خدا ترسی، شب بیداری، علم دوستی، معارف پروری اور انسانیت نوازی جیسی اعلی اخلاق وصفات میں انسانی تاریخ کے آئیڈیل افراد میں سے ایک تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے جس وقت اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی، وہ اسلامی علوم وفنون کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، ہر طرف علم وحکمت کی حکمرانی تھی، سلطنت اسلامیہ کے چپے چپے پر علم ومعرفت کا چرچا تھا، عالم اسلام کے تمام بلاد وامصار تعلیم وتعلم کا گہوارہ بنے ہوئے تھے، ہر بڑا شہر مستقل مرکز تھا، جہاں درس وافادہ کے بڑے بڑے دربار سجے ہوئے تھے۔ تمام عالم اسلام کی فضا علم کی خوشبو سے معطر اور قال اللہ وقال الرسول کے زمزموں سے پرشور تھی۔ صحابہؓ کا عہد زریں رخصت پذیر تھا، آنحضرت ﷺ کی صحبت سے مشرف ہوکر آفتاب نبوت سے براہ راست اقتباس علم کرنے والی مقدس جماعت تقریباً دنیا سے اٹھ چکی تھی۔ بعض بعض شہروں میں اکا دکا صحابیِ رسول مہر درخشاں کی طرح علم

ودین کی روشنی بکھیر رہے تھے۔ اب صحابہ کے تلامذہ اوران کے صحبت یافتہ افراد اشاعت علم ودین کی ذمہ داری سنبھال رہے تھے، اور ہمہ تن توجہ، انہماک اور تن دہی ودلجمعی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ یوں تو اسلامی دنیا کا شاید ہی کوئی شہر رہا ہوگا جو درس وتدریس کی گرم بازاری سے خالی رہا ہو، تاہم بعض شہر ایسے تھے جو علمی وفنی سرگرمی کے لحاظ سے ممتاز تھے، ان ہی میں صوبۂ عراق کا شہر کوفہ تھا، جو علمی سرگرمیوں میں حجاز کے شہر مکہ ومدینہ سے کسی طرح کم نہ تھا، بلکہ چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا دارالخلافہ ہوجانے کے بعد یہ شہر قلمروئے علمی کا بھی پایۂ تخت بن چکا تھا، جہاں ہر علم وفن کے ائمہ درس وتدریس کی بساط بچھا کر میراث نبوت کی نشر واشاعت میں مشغول تھے، یہ ایک حقیقت ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا دور علمی، فکری، ثقافتی اور تمدنی نقطۂ نظر سے انسانی تاریخ کا نہایت روشن اور تابناک دور اور اس کا ایک بڑا ہی زریں باب تھا۔

ولادت اور تابعیت:

امام صاحب مشہور قول کے مطابق ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، قافلۂ صحابہؓ میں سے جو لوگ دنیا میں رہ گئے تھے، ان کے روئے انور سے اپنی نگاہوں کو روشن اور قلب کو منور کیا، اس وقت مختلف بلاد وامصار میں متعدد صحابہ بقید حیات تھے، سب نہیں تو بعض کے دیدار سے مجال انکار نہیں۔ علامہ سیوطی نے اپنی کتاب **تبييض الصحيفة فی مناقب الإمام أبي حنيفة** میں حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے کہ:

أدرک الإمام أبوحنيفة جماعة من الصحابة، لأنه ولد بمكة سنة ثمانين من الهجرة.

وبها يومئذٍ من الصحابة: عبدالله بن أبي أوفى، فإنه مات بعد ذلک بالاتفاق، وبالبصرة يومئذٍ أنس بن مالک ومات سنة تسعين أو بعدها. وقد أورد ابن سعد بسند لا بأس به أن أبا حنيفة رأى أنساً وكان غير هذين من الصحابة بعده في البلاد أحياء.

یعنی امام ابوحنیفہؒ نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے، کیونکہ وہ ۸۰ھ میں مکہ میں پیدا ہوئے، اور اس وقت وہاں صحابہ کرامؓ میں سے عبداللہؓ بن ابی اوفی حیات تھے، کیونکہ اس

پر اتفاق ہے کہ ان کی وفات اس کے بعد ہوئی ہے، اور بصرہ میں اس وقت حضرت انس بن مالکؓ تھے، ان کا انتقال ۹۰ھ میں یا اس کے بعد ہوا ہے، اور ابن سعد نے ایک بے عیب سند سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، اور اس وقت ان دونوں صحابیوں کے علاوہ بھی چند دوسرے صحابہ زندہ تھے۔

ہم نے **تبییض الصحیفة** کے جس نسخے سے اس قول کو نقل کیا ہے، اس میں مکہ میں پیدا ہونا مذکور ہے، لیکن بظاہر یہ نسخہ نویس یا کاتب کی غلطی ہے، اس لیے کہ حافظ ابن حجر کا یہ قول ''عقود الجمان'' میں بھی مذکور ہے، اور اس میں مکہ کے بجائے کوفہ ہے، اور اسی کی تائید دوسرے حوالوں سے بھی ہوتی ہے۔

علامہ ذہبی، حافظ ابن حجر اور دوسرے محقق مصنفین کی تحریروں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، کہ امام ابوحنیفہؒ نے بعض صحابہ کو اور خصوصاً خادم رسول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، تاریخ اسلام کے عظیم المرتبت مؤرخ ومصنف حافظ ذہبی نے لکھا ہے:

رأى أنس بن مالک غير مرة لما قدم عليهم الكوفة(۱)

حضرت انس بن مالکؓ جب کوفہ آئے تو ان کو بارہا دیکھا ہے۔

اس طرح امام صاحب کو تابعی ہونے کا تمغہ حاصل ہے، اور یہ اتنا بڑا اشرف ہے کہ اس شرف وفضیلت میں ان کے معاصرین اور ان کے زمانے کے دوسرے ائمہ مجتہدین میں سے کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

ولم يثبت ذلک لأحد من أئمة الأمصار المعاصرين له كالأوزاعي بالشام، والحمادَين بالبصرة، والثوري بالكوفة، ومالک بالمدينة، ومسلم ابن خالد الزنجي بمكة، والليث بن سعد بمصر، والله أعلم(۲).

یعنی یہ شرف تابعیت امام صاحب کے معاصر دوسرے شہروں کے ائمہ میں سے کسی کو حاصل نہیں ہوا ہے، مثلاً شام میں امام اوزاعی، بصرہ میں حماد بن زید وحماد بن سلمہ، کوفہ میں سفیان ثوری، مدینہ میں امام مالک، مکہ میں مسلم بن خالد زنجی اور مصر میں لیث بن سعد۔

---

(۱) تذکرة الحفاظ: ۱۵۸/۱

(۲) تبییض الصحیفة، عقود الجمان: ۵۰

تحصیل علم اور شیوخ واساتذہ:

اُس وقت علم کے جو سرچشمے جاری تھے، ان سے وہ سیراب ہوئے، کوفہ کے علاوہ مکہ، مدینہ اور بصرہ کے راویان حدیث کے حلقۂ درس سے مستفیض ہوئے، اور اپنی جد وجہد کو صرف حدیث کی روایت اور سند واجازت تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ فقہاء کی مجلسوں اور ان کے حلقہ ہائے درس میں بھی شریک ہوئے، امام صاحب کے مشائخ حدیث کی کتنی بڑی تعداد ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے، کہ علامہ مزی نے تہذیب الکمال میں ان کے ۷۷شیوخ کا نام بنام ذکر کیا ہے، اور ان میں بیشتر وہ محدثین اور راویان حدیث ہیں، جن کے اوپر اس زمانے میں روایت حدیث کا مدار تھا، لیکن یہ امام صاحب کے اساتذہ ومشائخ کی کل تعداد نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن حجرؒ مکی نے لکھا ہے کہ ان کے شیوخ حدیث کی تعداد چار ہزار تک پہنچتی ہے، اور علامہ محمد بن یوسف صالحی دمشقی شافعی نے عقود الجمان میں ۲۲صفحات میں ان کے شیوخ کے صرف نام ذکر کیے ہیں، حالات وغیرہ نہیں ذکر ہیں۔ اس فہرست اور کثرت تعداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے علم اور خاص طور سے حدیث شریف کی تحصیل میں کس قدر محنت اور جد وجہد کی، اور نہ جانے کہاں کہاں کے مشائخ حدیث سے اس مبارک علم کو حاصل کیا۔ امام صاحب کا شمار ان محدثین میں ہوتا ہے جنھوں نے حدیث کی تحصیل اور اس کے حفظ کا غیر معمولی اہتمام کیا، یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی نے آپ کا ذکر ''تذکرۃ الحفاظ'' میں اور علامہ سیوطی نے ''طبقات الحفاظ'' میں کیا ہے۔

تلامذۂ امام اعظم:

حدیث کی تحصیل کے بعد اس کو اپنے تلامذہ میں بیان اور روایت بھی کیا، چنانچہ علامہ مزی نے ان سے روایت کرنے والے ۹۷ شاگردوں کا اسی طرح نام بنام ذکر کیا ہے، جیسے ان کے اساتذہ وشیوخ کا کیا ہے، مگر یہ تعداد ان ہی تلامذہ پر منحصر نہیں ہے، بلکہ درحقیقت اس سے کہیں زائد ہے؛ اس لیے کہ علامہ دمشقی شافعی نے عقود الجمان کے پانچویں باب میں لکھا ہے:

في ذكر بعض الآخذين عنه الحديث والفقه من أهل مكة، والمدينة، ودمشق، والبصرة، وواسط، والمَوصِل، والجزيرة، والرَّقة، ونصِيبِين، والرَّمْلَة،

ومصر، واليمن، واليمامة، والبحرين، وبغداد، والأهواز، وكِرمان، وإصبهان، وحُلوان، وإستراباذ، وهَمَذان، ونُهاوَند، والرَّيِّ، وقُومِس، والدَّامِغَان، وطَبَرسَتان، وجُرجان، ونيسابور، وسَرَخُسَ، ونَسا، ومَرو، وبخاریٰ، وسمرقند، وكِسَّر، وصغانيان، وترمذ، وبَلْخ، وهراة، وقُهستان، والزَّم، وخُوارِزم، وسِجستان، والمدائن، والمِصِّيصة، وحِمُص، وغير ذلک من بلاد الإسلام.

یعنی مکہ، مدینہ، دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصبہان، حلوان، استراباذ، ہمذان، نہاوند، رے، قومس، دامغان، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، مرو، بخاری، سمرقند، کسَّر، صغانیان، ترمذ، بلخ، ہراۃ، قہستان، زَم، خوارزم، سجستان، مدائن، مصیصہ، حمص، وغیرہ کے اہل علم نے آپ سے حدیث وفقہ کی تحصیل کی تھی۔

صرف ان مقامات کی فہرست پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بڑی تعداد نے آپ سے کسب فیض کیا تھا، اور آپ کے علم وتفقہ کی شہرت کس طرح عالم اسلامی کے دور دراز علاقوں اور شہروں میں پھیلی ہوئی تھی، یہ صرف ۴۵ شہروں کے نام ہیں، جو اس وقت کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے شہر تھے، ان میں سے ہر شہر کے نہ جانے کتنے تشنگان علم ومعرفت نے اپنی علمی پیاس بجھائی ہوگی، اور آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والے ان مقامات کے علاوہ اور نہ جانے کہاں کہاں کے لوگ ہوں گے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مقامات کا نام لینے کے بعد علامہ دمشقی نے لکھا ہے:

واستيعاب الآخذين عن الإمام أبي حنيفة متعذر لا يمكن حصره.

امام ابوحنیفہ سے علم حاصل کرنے والوں کا احاطہ کرنا مشکل ہے، ان کو شمار میں لانا ممکن نہیں ہے۔

پھر حافظ ابو محمد حارثی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ سے حدیث روایت کرنے والوں کی تعداد حَکَم بن عُتَیبہ، ابن ابی لیلی، ابن شبرمہ، سفیان ثوری، شریک، حسن بن صالح، یحییٰ بن سعید، ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن، مالک بن انس، ہشام بن عروہ، ابن جریج، اوزاعی، ایوب سختیانی، ابن عون، سلیمان تیمی، ہشام دستوائی، سعید بن ابی عروبہ، معمر بن راشد، شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ جیسے ائمہ علم وحفاظ حدیث سے زیادہ ہے۔ ان سب حضرات کے اتنے تلامذہ اور استفادہ کرنے والے نہیں ہوئے،

جتنے امام ابوحنیفہ کے ہوئے، اور احادیث کی تفسیر، مسائل واحکام اور عدالت وقضا کے فیصلوں میں کسی سے بھی لوگوں نے وہ فائدہ نہیں اٹھایا جو امام صاحب اور ان کے شاگردوں سے اٹھایا(۱)۔

اس کے بعد صاحب عقود الجمان نے ۶۸ صفحات میں صرف ان کے شاگردوں کے نام ذکر کیے ہیں، یعنی ۶۸ صفحات میں صرف ان کا نام ذکر ہے، حالات نہیں ہیں۔

سلسلۂ درس کی اسی وسعت کو دیکھ کر علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

''مختصر یہ کہ ان کی استادی کے حدود خلیفۂ وقت کے حدود حکومت کے برابر تھے''(۲)۔

امام صاحب کا امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے صرف حدیث پاک کی تحصیل اور اس کی اِسناد وروایت پر بس نہیں کیا، بلکہ ان کے اندر غور وفکر اور تدبر کرکے ان کا وہ معنی ومفہوم اخذ کیا، جو ان احادیث کی گہرائیوں میں پائے جاتے ہیں، اور جہاں تک ظاہر بیں نگاہیں پہنچنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ کسی مسئلے کے استخراج واستنباط کے لیے اصل ضرورت تو وہبی استعداد وصلاحیت کی ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے لیے بھی کسی صاحب فکر ونظر اور بابصیرت استاذ کی ہدایت ورہنمائی درکار ہوتی ہے، امام صاحب کو اس ہفت قلزم کو طے کرنے کے لیے جو خضر راہ ملے، ان میں سب سے اہم اور نمایاں حضرت حماد بن ابی سلیمان -متوفی ۱۲۰ھ- تھے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہ نے اگرچہ حماد کے سوا اور بزرگوں کی خدمت میں بھی فقہ کی تحصیل کی، لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ اس فن خاص میں وہ حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے''(۳)۔

ان کی صحبت میں عرصۂ دراز تک رہ کر فکر ونظر کی وہ صلاحیت پیدا کی، جس میں ان کا کوئی نظیر نہیں، حماد کی خدمت میں امام صاحب تقریباً ۲۰ برس رہے، ان کے علاوہ انھوں نے ان سرچشموں سے بھی تحصیل علم کی جو دوسرے صحابہؓ سے ان کے شاگردوں کے واسطے سے منتقل ہو رہے تھے، اور خاص طور سے جن کا شمار فقہاء صحابہ میں ہوتا تھا۔ حافظ سیوطی وغیرہ نے لکھا ہے کہ:

دخل أبوحنيفة يوماً على المنصور وعنده عيسىٰ بن موسىٰ، فقال المنصور: هذا عالم الدنيا اليوم، فقال له: يا نعمان عمن أخذت العلم؟

(۱) عقود الجمان: ۹۰ (۲) سیرۃ النعمان: ۵۱ (۳) ایضاً: ۲۹

قال: عن أصحاب عمر، عن عمر، وعن أصحاب علي عن علي، وعن أصحاب عبدالله عن عبدالله، وما كان في وقت ابن عباس على وجه الأرض أعلمُ منه. قال: لقد استوثقت لنفسک.

یعنی ایک روز امام ابوحنیفہ منصور کے پاس گئے، تو وہاں عیسیٰ بن موسیٰ موجود تھے، منصور نے کہا کہ یہ آج دنیا بھر کے عالم ہیں (دنیا کے سب سے بڑے عالم ہیں)۔ یہ سن کر عیسیٰ بن موسیٰ نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا کہ آپ نے علم کہاں سے حاصل کیا؟ امام صاحب نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے شاگردوں کے واسطے سے حضرت عمرؓ کا علم، حضرت علیؓ کے شاگردوں کے واسطے سے حضرت علیؓ کا علم، اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کے ذریعے ان کا علم، اور پھر جب ابن عباسؓ کا زمانہ آیا تو روئے زمین پر ان سے بڑھ کر کوئی صاحب علم نہیں تھا۔ عیسی نے کہا کہ آپ نے نہایت مضبوط اور ٹھوس علم حاصل کرلیا ہے۔

یہ وہ صحابۂ کرام تھے جو آنحضرت ﷺ کی صحبت سے مشرف ہونے کے علاوہ، فقہی بصیرت اور علمی گہرائی و گیرائی میں دوسرے صحابۂ کرامؓ سے بہت ممتاز تھے، امام ابوحنیفہؒ نے ان کے علوم و معارف کو صرف چند واسطوں سے حاصل کر کے ان پر اپنے فقہی اجتہادات کی بنیاد رکھی۔ لہٰذا بغیر کسی شک وشبہہ کے یہ بات پوری قوت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، کہ امام صاحب نے اجلۂ صحابہ کے اجلۂ تلامذہ کے واسطے سے قرآن وسنت کا جو علم حاصل کیا، اس میں گہری فکر و بصیرت سے کام لے کر، غور وخوض اور تدبر کر کے ملت اسلامیہ کے عمل کے لیے جو قانون مرتب کیا، اس سے زیادہ مستند اور مضبوط بھلا کون سا قانون ہوسکتا ہے۔ جو فرد کی انفرادی زندگی سے لے کر امت کی اجتماعی زندگی کے ایک ایک پہلو پر محیط ہے۔

امام صاحب کی وسعت علمی اور ہمہ گیری:

بعض کوتاہ بینوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو فقہ کے علاوہ دوسرے علوم میں مہارت یا بصیرت نہیں حاصل تھی، علامہ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی نے اس خیال کو تہمت اور باطل قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

''احذر أن تتوهم من ذلک أن أبا حنيفة لم يكن له خبرة تامة بغير

الفقه، حاشا لله كان في العلوم الشرعية من التفسير والحديث والآلة من العلوم الأدبية والمقاييس الحكمية بحراً لا يُجارى، وإماماً لا يمارى، وقول بعض أعدائه فيه خلاف ذلك منشؤه الحسد، وحجته الترفع على الأقران ورميهم بالزور والبهتان، ويأبى الله إلا أن يُتم نوره(۱).

یعنی ان کے فقہی کمالات کی وجہ سے یہ ہرگز نہ خیال کرو کہ ان کو فقہ کے علاوہ دوسرے علوم میں مہارت نہیں حاصل تھی، حاشا وکلا! دوسرے علوم شرعیہ جیسے تفسیر، حدیث، اور علوم آلیہ جیسے علم ادب اور علوم عقلیہ میں وہ اس سمندر کی طرح تھے جس میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، اور ان علوم کے ایسے امام تھے جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اور ان کے بعض دشمنوں نے اس کے خلاف باتیں جو کہی ہیں، اس کا سبب حسد ہے، اور ان کا مقصد اپنے ہم عصروں پر اپنی برتری ظاہر کرنا اور جھوٹ و بہتان باندھنا ہے، اور اللہ پاک اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔

تاریخ کا یہ کتنا عجیب وغریب واقعہ اور نیرنگیٔ زمانہ کی کیسی حیرت انگیز مثال ہے کہ کوفہ کے وہی ابوحنیفہ جو عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کی پاداش میں حاکم وقت کے کوڑے کھاتے ہیں، اور قید وبند کی صعوبت برداشت کرتے ہیں، ایک وقت آتا ہے کہ اسی امام کا ترتیب دیا ہوا قانون خلافت اور حکومت وسلطنت کا آئین اور قانون قرار پاتا ہے، اور تمام قلمروئے اسلامی میں اسی قانون پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ درس گاہوں اور تعلیم گاہوں سے لے کر، مسجدوں کے منبروں ومحرابوں، عدالتوں، قضا کے محکموں، اور حکومت کے ایوانوں تک میں امام ابوحنیفہ کی مرتب ومدون کردہ فقہ اور اس کی جزئیات پر عمل ہوتا ہے۔ مصر کے عظیم مصنف شیخ ابوزہرہ نے کس قدر صحیح اور سچی بات لکھی ہے کہ:

”مذهب أبي حنيفة مذهب شرق وغرب، وتناولته أعراف في أقاليم مختلفة متباينة، وقد اختبره القضاء وصقّله أزماناً متطاولة، فقد كان مذهب القضاء ردحاً طويلاً في بغداد أيام سلطان العباسيين، ولما انتحل العباسيون نحلة الخلافة الإسلامية، وتسموا باسم الخلفاء، ومذهبهم

(۱) الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان: ۵۷

الرسمي هو مذهب أبي حنيفة، صار هو مذهب الخلافة، فكان في العراق ومصر والشام وغيرها من الأقاليم المذهب الرسمي ثم امتدّ نفوذه حتى صار مذهب الهنود المسلمين، ثم تجاوز ربوع الهند فكان مذهب المسلمين في الصين"(۱).

امام ابوحنیفہ کے مذہب کی حدود مشرق ومغرب تک پھیلی ہوئی تھیں، مختلف اور جدا جدا علاقوں کے طرز معاشرت نے اس کو قبول کیا، صیغۂ قضا نے اس کو آزمایا اور مدت دراز تک اس کو صیقل کیا، چنانچہ عباسیوں کے عہد حکومت میں طویل مدت تک عدالت کا مذہب رہا، جب عباسیوں نے خلافت اسلامیہ کی قبا زیب تن کی، اور اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کیا، تو سرکاری مذہب امام ابوحنیفہ کا مذہب ہی قرار پایا، اس طرح وہ خلافت اسلامیہ کا مذہب رہا، عراق، مصر اور شام جیسے علاقوں میں اس کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل رہی، پھر اس کا دائرہ اثر دراز ہوتا رہا حتی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مذہب بن گیا، پھر ہندوستان کے سبزہ زاروں سے تجاوز کر کے چین پہنچا اور وہاں کے مسلمانوں کا مذہب بنا۔

مذہب حنفی کا یہ پھیلاؤ، ایوان حکومت تک اس کی رسائی اور عدل وقضا کے لیے اس کا انتخاب کوئی اتفاقی بات نہ تھی، بلکہ یہ فقہ حنفی کی جامعیت اور ہمہ گیری تھی، جس کے ہم پلہ کسی دوسرے امام کی فقہ نہیں تھی۔

فقہ حنفی کے سر چشمے:

یہ سخت ستم ظریفی ہے کہ بڑے پیمانے پر یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب قیاسات کا مجموعہ ہے، اور فقہ حنفی کی بنیاد رائے واجتہاد پر قائم ہے، ان کے ہاں قیاس ورائے کے آگے حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ انتہائی سنگین الزام، بدترین اتہام اور ایسا بے سروپا پروپیگنڈہ ہے جس کا حقیقت واقعہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اپنی فقہ کی بنیاد کے بارے میں خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے زیادہ کسی کی بات کی اہمیت نہیں ہوسکتی، امام صاحب بانگ دہل فرماتے ہیں:

---

(۱)أبو حنيفة: حياته وعصره– آراؤه وفقهه:۱۰-۱۱

إذا جاء الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعلى الرأس والعين، وإذا جاء عن الصحابة اخترنا ولم نخرج من قولهم، وإذا جاء عن التابعين زاحمناهم(۱).

یعنی اگر کسی مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہوتی ہے تو ہم اس کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں، اور اگر آپ کی کوئی حدیث نہ ملے تو صحابہ کے اقوال میں سے انتخاب کرتے ہیں، اور اس سے باہر نہیں نکلتے، ہاں جب بات تابعین کی آتی ہے تو ہم اور وہ برابر ہیں۔

دیکھئے صرف حدیث رسول نہیں، بلکہ اقوال صحابہ سے بھی روگردانی نہیں کرتے، حدیث نبوی کی تو بہت بڑی بات ہے۔ حضرت سفیان ثوری جو امام صاحب کے ہم عصر و ہم شہر اور نہایت بلند رتبہ محدث تھے، ان کے پاس ایک بڑے عالم و عابد شخص آئے اور کہنے لگے کہ:

سمعته يقول قولاً فيه إنصاف: آخذ بكتاب الله تعالىٰ، فإن لم أجد في كتاب الله تعالىٰ، فبسنة رسوله صلى الله عليه وسلم، فإن لم أجد في سنته صلى الله عليه وسلم أخذت بقول أصحابه من شئت منهم وأدع من شئت ولم أخرج عن قولهم إلى قول غيرهم، فأما إذا انتهى الأمر وجاء إلى إبراهيم والشعبي وابن سيرين وحسن وسعيد بن المسيب —وعدد رجالاً— فقوم اجتهدوا فأجتهد كما اجتهدوا" قال: فسكت سفيان(۲).

امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں مسئلے کا حل کتاب اللہ میں تلاش کرتا ہوں، مگر جب کتاب اللہ میں نہیں ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دیکھتا ہوں، لیکن اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے تو صحابہ کے مختلف اقوال میں سے جس کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، لیکن صحابہ کے قول سے باہر نہیں نکلتا ہوں، لیکن جب اس میں بھی مسئلے کا حل موجود نہ ہو اور معاملہ ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرین، حسن بصری، اور سعید بن المسیب -اسی طرح کئی لوگوں کا نام لے کر کہا کہ- ان تک پہنچتا ہے، تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے

(۱) عقود الجمان: ۱۷۳ (۲) ایضاً: ۱۷۳

اجتہاد کیا، تو جس طرح انھوں نے اجتہاد کیا ہے، اسی طرح ہم بھی اجتہاد کرتے ہیں۔ سفیان ثوری یہ بات سن کر خاموش رہ گئے۔

اور فضیل بن عیاض جیسے عابد وزاہد اور احادیث کے بلند مرتبہ راوی نے کہا ہے کہ:

كان أبو حنيفة إذا وردت عليه مسألة فيها حديث صحيح اتبعه، وإن كان عن الصحابة والتابعين فكذلك، وإلا قاس فأحسن القياس(۱).

یعنی امام ابوحنیفہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی صحیح حدیث ہوتی ہے، تو اس کی پیروی کرتے ہیں، اور اگر حدیث نہ ہو تو صحابہ حتی کہ تابعین کے اقوال کو بھی لائق اعتناء قرار دیتے ہیں، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو قیاس کرتے ہیں اور بہترین قیاس کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ حدیث پر کس قدر شدت اور سختی سے جمے رہتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جامعۃ الامام محمد بن سعود کے پروفیسر دکتور ناصر بن عقیل بن جاسر طریفی نے اپنی کتاب **تاریخ الفقه الإسلامي** میں امام صاحب کے اصول مذہب لکھے، تو اس میں کتاب اللہ کے بعد یہ لکھا کہ: "**التشدد في قبول الحديث**" یعنی حدیث قبول کرنے میں شدت سے کام لینا، جب کہ باقی ائمہ کے اصول میں کتاب اللہ کے بعد **السنة یا السنة النبوية** لکھا ہے۔

امام صاحب محدثین ومعاصرین کی نظر میں:

یہ ایک بڑی ناخوش گوار حقیقت ہے کہ تاریخ اسلام کی اس عظیم اور قابل فخر ہستی کو باوجود ان کے علم وفضل، جلالت قدر ومنزلت، زہد وتقویٰ کے ہدف تنقید بنایا گیا، اور ان کی شخصیت پر جرح وقدح کی گئی، لیکن اس کے برعکس ان کے علم وفضل کی مدح وستائش کرنے والوں اور خراج تحسین پیش کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہے، کہ اس کے سامنے نقد وجرح کرنے والوں کا قول ہباءً منثوراً ہوکر رہ جاتا ہے۔ امام صاحب کی تعریف وتوصیف اور تعدیل وتوثیق میں تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں جو اقوال مذکور ہیں، ان سب کا ذکر تو طوالت کا باعث ہوگا، اس لیے نمایاں اور ممتاز اہل علم ہی کے اقوال ذکر کیے جاتے ہیں۔

۱- **محمد بن علی ابوجعفر الباقر**:- آپ کی عظمت شان اور جلالت رتبہ کی اس سے بڑی سند کیا

(۱) عقود الجمان: ۲: ۱۷۲

ہوسکتی ہے کہ حضرت علی زین العابدین کے لڑکے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔ علامہ ابن عبدالبر نے **الانتقاء في فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء** میں لکھا ہے کہ ابوجعفر محمد بن علی کی خدمت میں ابوحنیفہ آئے، ان سے کسی مسئلے پر گفتگو کی، جب وہ واپس چلے گئے تو امام ابوجعفر نے فرمایا کہ: **ما أحسن هديه و سمته، وما أكثر فقهه!** ان کا طور طریقہ کتنا اچھا، اور ان کا فقہ کس قدر زیادہ ہے۔

امام باقر کی وفات ۱۱۷ھ میں یا ۱۱۸ھ میں یا ۱۱۴ھ میں ہوئی ہے[1]۔ یعنی جس وقت حضرت علی مرتضی کے پڑپوتے حضرت امام باقر جیسے پیکر علم و عمل امام ابوحنیفہ کے حسن سیرت اور خوش اخلاقی کے ساتھ ان کی کثرت فقہ کی تعریف کر رہے تھے، اس وقت امام صاحب کی عمر زیادہ سے زیادہ ۳۵-۳۷ سال رہی ہوگی۔

۲-حماد بن ابی سلیمان-متوفی ۱۲۰ھ- : انتقاء ہی میں ہے کہ کسی مسئلے میں امام صاحب کی گفتگو ان کے استاد حماد بن ابی سلیمان سے ہوئی، جب ابوحنیفہ وہاں سے اٹھ گئے تو حماد نے کہا: **هذا مع فقهه يحيى الليل ويقومه.** یعنی یہ شخص فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ پوری رات جاگ کر اور کھڑے ہوکر (نماز میں) گزارتے ہیں۔

۳-ایوب سختیانی-متوفی ۱۳۱ھ- : بصرہ کے رہنے والے حدیث کے نہایت جلیل القدر راوی اور برگزیدہ وصاحب کرامت بزرگ تھے، حماد بن زید کہتے ہیں کہ میں حج کے لیے جارہا تھا، جب ایوب سے رخصت ہونے کے لیے ان کے پاس گیا تو مجھ سے فرمایا کہ:

بلغني أن فقيه أهل الكوفة أبا حنيفة يريد الحج، فإذا لقيتَه فأقرِئه مني السلام.[2]

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہل کوفہ کے فقیہ ابوحنیفہ بھی حج کے لیے جارہے ہیں، ان سے ملیے تو میرا سلام کہئے۔

۴-مِسْعَر بن کِدام-متوفی ۱۵۳ھ یا ۱۵۵ھ- : بڑے پایہ کے محدث اور راوئ حدیث تھے، ان کا قول ہے: **رحم الله أبا حنيفة إنه كان لفقيهاً عالماً۔**[3]

(۱) اعیان الحجاج: ۱/۱۰۴ (۲) الانتقاء: ۱۹۵

(۳) الانتقاء: ۱۹۵، مناقب الإمام أبي حنيفة وصاحبيه: ۱۸، وفیات الاعیان: ۳/۲۰۳

اللہ ابوحنیفہ پر اپنی رحمت نازل فرمائے، وہ بے شبہہ ایک فقیہ اور عالم تھے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک نے فرمایا ہے:

رأيتُ مِسعَراً في حلقة أبي حنيفة يسأله ويستفيد منه، وقال: ما رأيتُ أفقهَ منه(۱).

میں نے مسعر کو امام ابوحنیفہؒ کے حلقۂ درس میں سوال کرتے اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، مسعر کہتے تھے کہ میں نے ان سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا۔

۵-**اعمش** -متوفی ۱۴۸ھ- : حدیث پڑھنے والا کوئی طالب علم نہیں ہوگا، جو اعمش کے نام سے واقف نہیں ہوگا، ان سے ایک دفعہ کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو جواب میں فرمایا کہ:

إنما يُحسن الجواب في هذا ومثلِه النعمانُ بن ثابت الخزَّاز، أُراه بُورِك له في علمه. (۲)

یعنی اس قسم کے سوال کا جواب تو نعمان بن ثابت (ابوحنیفہ) ہی بہتر دے سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے علم میں برکت دی گئی ہے۔

عبیداللہ بن عمرو رقی کہتے ہیں کہ ہم اعمش کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہاں ابوحنیفہ بھی تھے، اعمش سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے ابوحنیفہ سے کہا کہ آپ اس کو بتلا دیجئے، امام ابوحنیفہ نے جب مسئلہ بتلایا تو امام اعمش نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ مسئلہ کہاں سے بتلایا، ابوحنیفہ نے کہا کہ فلاں حدیث جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی، اس سے اخذ کیا ہے، اس وقت اعمش نے کہا:

أنتم الأطباء ونحن الصيادلة. (۳)

یعنی آپ لوگ طبیب ہیں، اور ہم دوا فروش ہیں۔

امام ابوحنیفہ فقیہ تھے، اور کتاب وسنت میں غور کرکے مسائل کا استنباط کرنا ان ہی کا کام تھا، اس طرح گویا ان کی حیثیت ایک معالج کی طرح تھی، جو مرض کی تشخیص اور اس کا علاج جانتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو لوگ صرف حدیث روایت کرتے ہیں، وہ گویا دوا فروش کی طرح ہیں، جو دوا تو دے

---

(۱) الخیرات الحسان: ۶۹ (۲) الانتقاء: ۱۹۶، سیر اعلام النبلاء: ۶/۴۰۳، تاریخ الاسلام: ۳/۳۹۵

(۳) مناقب الإمام ابي حنيفة: ۲۱

سکتے ہیں، لیکن علاج نہیں کر سکتے۔

۶-**شعبۃ بن الحجّاج -متوفی ۱۶۰ھ-** : روایت حدیث کے ساتھ ساتھ علم جرح وتعدیل میں بھی نہایت اونچا مقام رکھتے ہیں، اگر کسی کی تعریف کردیں، تو اس کی شخصیت مسلّم ہوجاتی ہے، ان کی نسبت علامہ ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے کہ:

كان شعبة حسن الرأي في أبي حنيفة(۱)

شعبہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔

جب امام ابوحنیفہ کی وفات ہوئی تو شعبہ نے کہا کہ:

لقد ذهب معه فقه الكوفة، تفضّل الله علينا وعليه برحمته(۲).

ان کے ساتھ کوفہ کا علم بھی چلا گیا، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ اور ان کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے۔

ان حضرات کے بارے میں علامہ عینی نے **مغاني الأخيار في شرح أسامي رجال معاني الآثار** (۱۳۵/۳) میں لکھا ہے کہ:

وكان مسعر بن كدام، وأيوب السختياني، والأعمش وشعبة يُثنون على أبي حنيفة.

مسعر بن کدام، ایوب سختیانی، اعمش اور شعبہ یہ سب حضرات ابوحنیفہ کی تعریف کیا کرتے تھے۔

۷-**ابن جریج -متوفی ۱۵۰ھ-** : عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج بڑے بلند پایہ محدث اور راویٔ حدیث ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے بالکل ہم عصر تھے، ان کے بارے میں علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء (......) میں لکھا ہے کہ انھوں نے ستر سال کی عمر پائی، ان کی اور ابوحنیفہ کی عمر، سال ولادت اور سال وفات ایک ہے، روح بن عبادۃ کہتے ہیں کہ:

كنت عند ابن جريج سنة خمسين ومائة، وأتاه موت أبي حنيفة، فاسترجع وتوجَّع، وقال: أي علم ذهب!(۳)

(۱) انتقاء: ۱۹۶ (۲) ایضاً: ۱۹۶ (۳) تھذیب الکمال: ۳۴۱/۷

میں ۱۵۰ھ میں ابن جریج کے پاس بیٹھا ہوا تھا، آپ کو امام ابوحنیفہ کے انتقال کی خبر ملی، تو إنا لله و إنا إليه راجعون پڑھی، اور رنج کے ساتھ فرمایا کہ کتنا بڑا علم دنیا سے اٹھ گیا!۔

۸-**سفیان ثوری**-متوفی ۱۶۰ھ- : ان کی امامت حدیث وفقہ دونوں میں مسلّم ہے، مگر وہ امام ابوحنیفہ کے فضل وکمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کرتے تھے:

كان أبو حنيفة أفقه أهل الأرض في زمانه(۱).

ابوحنیفہ اپنے وقت میں روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔

عبداللہ بن داؤد خریبی کہتے ہیں کہ میں سفیان ثوری کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص نے ان سے حج کا ایک مسئلہ پوچھا، سفیان نے جواب دیا تو اس آدمی نے کہا کہ ابوحنیفہ نے تو یہ مسئلہ یوں بتلایا ہے، تو سفیان نے کہا:

هو كما قال أبو حنيفة ومن يقول غير هذا(۲).

ابوحنیفہ نے جو کہا ہے وہی صحیح ہے اس کے علاوہ کون کہہ سکتا ہے۔

محمد بن بشر کہتے ہیں کہ جب میں سفیان ثوری کے پاس آتا اور وہ پوچھتے کہ کہاں سے آرہے ہو؟ میں جواب دیتا کہ ابوحنیفہ کے پاس سے، تو سفیان کہتے:

لقد جئت من عند أفقه أهل الأرض(۳).

تم روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے آئے ہو۔

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ نے اپنی کتاب اعیان الحجاج میں سفیان ثوری کے سفر حج کے بارے میں لکھا ہے:

''ایک بار اس مبارک سفر میں وہ امام ابوحنیفہ کے رفیق تھے، تو ان کا معمول تھا کہ امام صاحب کو راستہ چلنے میں وہ ہمیشہ آگے رکھتے اور خود ان کے پیچھے چلتے، ان دونوں بزرگوں سے کوئی آدمی مسئلہ پوچھنے آتا تو سفیان کبھی جواب نہ دیتے بلکہ امام صاحب کو جواب دینے پر مجبور کرتے''(۴)۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۱۰/۱۱۴ (۲) انتقاء: ۱۹۸

(۳) تہذیب الکمال: ۷/۳۴۲ (۴) اعیان الحجاج: ۱/۱۱۶

۹-مُغیرہ بن مِقسَم ضبّی -متوفی ۱۳۶ھ- : فقیہ اور بلند پایہ محدث تھے، صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔ جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں کہ مجھ سے مغیرہ نے کہا:

جالس أبا حنيفة تفقَّهْ، فإن إبراهيم النخعي لو كان حياً لجالسه(۱).

یعنی ابوحنیفہ کی ہم نشینی اختیار کرو فقیہ ہو جاؤ گے، اگر ابراہیم نخعی بھی زندہ ہوتے تو ان کے پاس بیٹھتے۔

۱۰-سفیان بن عیینہ-متوفی ۱۹۸ھ- : اس پایہ کے محدث ہیں کہ امام شافعی وغیرہ نے ان کی خدمت میں رہ کر علم حدیث حاصل کیا ہے، علامہ ابن عبدالبر نے انتقاء (ص۱۹۹) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

أول من أقعدني للحديث بالكوفة أبو حنيفة، أقعدني في الجامع، وقال: هذا أقعد الناس بحديث عمرو بن دينار، فحدَّثتُهم.

پہلے آدمی جنھوں نے کوفہ میں مجھ کو درس حدیث کے لیے بٹھایا ابوحنیفہ ہیں، انھوں نے مجھے جامع مسجد میں بیٹھا دیا اور یہ کہا کہ عمرو بن دینار کی حدیث کے یہ سب سے بڑے واقف کار ہیں، چنانچہ میں نے وہاں لوگوں کے سامنے حدیث بیان کی۔

اور ابویعلی خلیلی نے الإرشاد (ص۸۸) میں ان کا یہ ارشاد یوں نقل کیا ہے:

أول من صيرني محدِّثاً أبو حنيفة.

پہلے شخص جس نے مجھے محدث بنایا ابوحنیفہ ہیں۔

علامہ ابن حجر مکی نے ابن عیینہ کے اس واقعے کو نقل کر کے لکھا ہے:

وبهذا يُعلم جلالة مرتبته في الحديث أيضاً، كيف وهو يستأمر في الثوري ويُجلس ابنَ عيينة.(۲)

اس واقعے سے علم حدیث میں بھی امام ابوحنیفہؒ کا جلالت رتبہ معلوم ہوتا ہے، ان کے رتبے کا کیسے پتہ نہیں چل سکتا جب کہ ان سے سفیان ثوری کے باب میں مشورہ لیا جاتا ہے،

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۶/۴۰۳، تاریخ الاسلام: ۳/۹۹۶

(۲) الخیرات الحسان: ۵۹

اورابن عیینہ (جیسے محدث) کو وہ درس وروایت حدیث کے لیے بٹھاتے ہیں۔

۱۱-**یحییٰ بن سعید قطان -متوفی ۱۹۸ھ-** : نہایت جلیل القدر محدث اورفن جرح وتعدیل کے امام تھے، وہ کہتے تھے:

لا نکذب اللّٰہ، ما سمعنا أحسن من رأي أبي حنيفة، وقد أخذنا بأكثر أقواله(۱).

یعنی ہم اللہ سے جھوٹ نہیں بول سکتے ، ہم نے ابوحنیفہ کی رائے سے بہتر رائے نہیں سنی،اورہم نے ان کے اکثر اقوال کواختیار کیا ہے۔

۱۲-**عبداللہ بن مبارک -متوفی ۱۸۱ھ-** : علم وعمل کے لحاظ سے نہ صرف اپنے زمانے کے، بلکہ اسلامی تاریخ کی ممتازاور منفرد شخصیات اور مایۂ ناز ہستیوں میں سے تھے،ان کے زمانے کے بڑے بڑے علماء وفضلا اوراولیاء واتقیاان کے فضل وکمال، زہد وتقویٰ اوران کے معمولات پر رشک کیا کرتے تھے، وہ کہا کرتے تھے:

لولا أن اللّٰہ عز وجل أغاثني بأبي حنيفة وسفيان كنت كسائر الناس(۲).

یعنی اگر اللہ رب العزت نے ابوحنیفہ وسفیان ثوری کے ذریعہ میری دستگیری نہ فرمائی ہوتی، تو میں عام آدمیوں کی طرح ہوتا۔

ابن المبارک کا یہ قول بھی ہے کہ:

أبو حنيفة أفقه الناس(۳).

ابوحنیفہ لوگوں میں سب سے بڑے فقیہ ہیں۔

ابن المبارک یہ بھی کہا کرتے تھے:

ما رأيت أحداً أورع من أبي حنيفة(۴).

---

(۱) تہذیب الکمال: ۳۴۲/۷ (۲) تہذیب الکمال: ۳۴۱/۷، سیر اعلام: ۳۹۸/۶

(۳) تذکرۃ الحفاظ: ۱۵۹/۱-۱۶۰، سیر اعلام النبلاء: ۴۰۳/۶، تاریخ الاسلام: ۹۹۱/۳

(۴) تہذیب الکمال: ۳۴۳/۷

میں نے ابوحنیفہ سے بڑا پرہیزگار نہیں دیکھا۔

۱۳-**امام مالک-متوفی ۱۷۹ھ-** : آپ کا شمار تاریخ اسلام کی قابل فخر ہستیوں میں ہے، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ آپ کی فقہ پر عمل پیرا ہے، ان سے ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے ابوحنیفہ کو دیکھا ہے؟ امام مالک نے کہا کہ جی ہاں! میں نے ان کو دیکھا ہے، اور ایسے آدمی کو دیکھا ہے کہ اگر اس ستون کے بارے میں تم سے کہیں کہ وہ سونے کا ثابت کر دیں گے، تو (اپنی قوت استدلال سے) اس کو ثابت کر دیں گے۔

۱۴-**حفص بن غیاث-متوفی ۱۹۴ھ یا ۱۹۵ھ-** : صحاح ستہ کے راویوں میں ہیں، حدیث کے ساتھ فقہ میں بھی بلند مقام رکھتے تھے، وہ کہتے تھے:

كلام أبي حنيفة في الفقه أدق من الشعر، لا يعيبه إلا جاهل[1].

فقہ میں ابوحنیفہ کا کلام شعر سے بھی زیادہ باریک ہے، اس کی عیب گیری وہی شخص کر سکتا ہے جو جاہل ہو۔

۱۵-**علی بن عاصم-متوفی ۲۰۱ھ-** : حدیثوں کے راوی ہیں، وہ کہا کرتے تھے:

لو وُزِن علمُ الإمام أبي حنيفة بعلم أهل زمانه، لرجح عليهم[2].

اگر امام ابوحنیفہ کا علم ان کے زمانے کے لوگوں کے علم کے مقابلہ میں تولا جائے، تو امام صاحب کے علم کا پلڑا بھاری پڑ جائے گا۔

۱۶-**یزید بن ہارون-متوفی ۲۰۶ھ-**: حدیث کے بہت بڑے راوی ہیں، صحاح ستہ کی ہر کتاب میں ان کی روایت کردہ حدیثیں موجود ہیں، وہ کہا کرتے تھے:

أدركتُ الناسَ فما رأيتُ أحداً أعقل ولا أفضل ولا أورع من أبي حنيفة[3].

یعنی میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے، لیکن ابوحنیفہ سے زیادہ عقل مند، ان سے بہتر اور ان سے زیادہ پرہیزگار کسی کو نہیں دیکھا۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۶/۴۰۳، تاریخ الاسلام: ۳/۹۹۵ (۲) سیر اعلام النبلاء: ۶/۴۰۳، تاریخ الاسلام: ۳/۹۹۵
(۳) تہذیب الکمال: ۷/۳۴۴

وہ یہ بھی کہتے تھے: کتبت عن ألف شيخ حملت عنهم العلم، ما رأيت والله فيهم أشدَّ ورَعاً من أبي حنيفة ولا أحفظ للسانه[۱].

میں نے ایک ہزار ایسے شیوخ سے حدیثیں لکھی ہیں جن سے میں نے علم حاصل کیا ہے، لیکن خدا کی قسم ان میں سے کسی کو بھی ابوحنیفہ سے بڑا پرہیز گار اور زبان کا محافظ نہیں دیکھا۔

۱۷- نضر بن شمیل - متوفی ۲۰۴ھ : ان کا شمار بھی اعلی درجے کے حفاظ حدیث اور نہایت ثقہ راویوں میں ہوتا تھا، انھوں نے فرمایا ہے:

كان الناس نياماً عن الفقه حتى أيقَظَهم أبو حنيفة بما فتقه وبيَّنه ولخَّصه[۲].

یعنی لوگ فقہ کی طرف سے سوئے ہوئے تھے، تا آنکہ ابوحنیفہ نے اپنی (فقہی) تشریح، توضیح اور تلخیص کے ذریعہ ان کو بیدار کیا۔

۱۸- عبداللہ بن داود خُرَیبی - متوفی ۲۱۱ھ : کہا کرتے تھے کہ:

يجب على أهل الإسلام أن يدعوا الله لأبي حنيفة في صلاتهم. قال: وذكر حفظه عليهم السنن والفقه[۳].

مسلمانوں کے لیے آنحضرت ﷺ کی سنتوں اور فقہ کی حفاظت کا ذکر کر کے کہتے تھے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ ابوحنیفہ کے لیے اپنی نمازوں میں دعا کیا کریں۔

۱۹- امام شافعی - متوفی ۲۰۴ھ : جیسے جلیل القدر امام متبوع فرمایا کرتے تھے کہ:

الناس في الفقه عيال على أبي حنيفة[۴].

لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے عیال اور ان کے محتاج ہیں۔

امام شافعی ہی کا یہ قول بھی ہے: **كان أبو حنيفة ممن وُفِّق له الفقه**[۵].

ابوحنیفہ کے لیے فقہ ہموار اور ساز گار بنادی گئی ہے۔

---

(۱) أخبار أبي حنيفة للصيمري: ۳۳

(۲) الخیرات الحسان: ۶۹

(۳) تہذیب الکمال: ۳۴۲/۷، البدایۃ والنہایۃ: ۱۱۴/۱۰

(۴) سیر اعلام النبلاء: ۴۰۳/۶ (۵) تہذیب الکمال: ۳۴۳/۷

۲۰-مکی بن ابراہیم-متوفی ۲۱۵ھ- : امام بخاری علیہ الرحمۃ کے اجلۂ شیوخ میں ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں انھوں نے فرمایا ہے:

كان أعلم أهل الأرض(۱).

روئے زمین کے سب سے بڑے عالم تھے۔

۲۱-خلف بن ایوب متوفی ۲۱۵ھ- : حدیث کے ثقہ راویوں میں ہیں، حافظ ذہبی نے ان کا شمار فقہاء احناف میں کیا ہے، انھوں نے فرمایا ہے:

صار العلم من الله تعالى إلى محمد ﷺ، ثم منه إلى أصحابه، ثم منهم إلى التابعين، ثم صار إلى أبي حنيفة وأصحابه، فمن شاء فليَرضَ، و من شاء فليَسخَط(۲).

یعنی علم اللہ تعالی سے محمد ﷺ کو ملا، پھر آپؐ سے آپ کے صحابہؓ کو ملا، صحابہؓ سے تابعین تک پہنچا، پھر تابعین سے ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں تک منتقل ہوا۔ چاہے کوئی راضی رہے یا ناراض ہو۔

۲۲-یحییٰ بن معین-۲۳۳ھ- : نہایت بلند پایہ محدث اور امام جرح وتعدیل تھے، انھوں نے امام صاحب کی تعریف میں کہا ہے:

كان أبو حنيفة ثقةً في الحديث(۳).

امام ابوحنیفہ حدیث میں ثقہ تھے۔

ان ہی کا یہ قول بھی ہے:

كان أبو حنيفة ثقة لا يحدث بالحديث إلا بما يحفظه ، و لا يحدث بما لا يحفظ(۴).

ابوحنیفہ حدیث کے باب میں ثقہ تھے، وہی حدیث بیان کرتے تھے جو ان کو یاد ہوتی

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۱۱۴، طبقات الحفاظ للسیوطی: ۸۰

(۲) الخیرات الحسان: ۲۷

(۳) تہذیب الکمال: ۷/۳۴۰

(۴) تہذیب الکمال: ۷/۳۴۰، سیر اعلام النبلاء: ۶/۳۹۵، طبقات الحفاظ: ۸۰

تھی، اور جو یاد نہ ہوتی اس کو بیان ہی نہ کرتے۔

اوران سے ایک دفعہ امام صاحب کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا کہ:

ثـقة مـا سـمـعـت أحـداً ضـعـفه، هذا شعبة بن الحجاج يكتب إليه أن يحدِّث، ويأمره، وشعبة شعبة[1].

یعنی وہ ثقہ ہیں میں نے کسی کو ان کی تضعیف کرتے ہوئے نہیں سنا ہے، دیکھئے شعبہ بن الحجاج خط لکھ کر ان سے حدیث بیان کرنے کو کہتے ہیں، اور اس پر مجبور کرتے ہیں اور شعبہ تو شعبہ ہی ہیں (یعنی کسی کے ثقہ ہونے کے لیے شعبہ کی سند ہی کافی ہے)۔

۲۳-علی بن المدینی-متوفی ۲۳۴ھ- : امام بخاری کے استاذ اور نہایت جلیل القدر محدث اور راوی حدیث تھے، اپنے وقت میں حدیث اور علل حدیث کے سب سے بڑے عالم خیال کیے جاتے تھے۔حضرت محدث الاعظمیؒ نے اپنی بیش بہا کتاب **الألبـانـي: شـذوذه وأخـطـاؤه** (ص ۱۴۱) میں علامہ ابن عبدالبر کی کتاب جامع بیان العلم سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

"إن أبـا حـنيـفة روى عـنـه الثـوري، وابـن المبارك، وحماد بن زيد، وهشيـم، ووكيع بن الجرح وعباد بن العوام، وجعفر بن عون، وهو ثقة، لا بأس به.

ابوحنیفہ سے سفیان ثوری، ابن المبارک، حماد بن زید ہشیم، وکیع بن الجراح، عباد بن العوام اور جعفر بن عون نے روایت کیا ہے، اور وہ ثقہ ہیں، ان کے اندر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۲۴-امام احمد بن حنبل-متوفی ۲۴۱ھ- : امام ابوحنیفہ کی ایک فضیلت وعظمت یہ بھی ہے کہ صبر واستقامت کے پہاڑ تھے، حاکم وقت نے ان کو منصب قضا قبول کرنے کے لیے مجبور کیا، تو انھوں نے انکار کر دیا، اس کی وجہ سے حاکم نے ان کی پشت مبارک پر کوڑے برسائے، لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کو جب عقیدۂ خلق قرآن کے مقابلہ میں قید وبند کی صعوبت اور حد درجہ اذیت دی گئی، تو اس وقت امام ابوحنیفہؒ کو بہت یاد کرتے تھے اور ان کی ثابت قدمی کی تعریف کیا کرتے تھے[2]۔

---

(۱) الانتقاء: ۱۹۷ (۲) مغانی الاخیار: ۱۳۶/۳

ہم نے تذکرہ وتراجم اور تاریخ کی کتابوں سے صرف نمونہ کے طور پر چند ائمۂ حدیث کے اقوال نقل کیے ہیں، ورنہ امام صاحب کی شان اور ان کی مدح وستائش میں تاریخ وسوانح کی کتابوں میں جو اقوال مذکور ہیں، ان سے ایک پورا دفتر تیار ہوسکتا ہے۔ اور اگر سچ پوچھئے تو امام ابوحنیفہ کے ثقہ اور عظیم المرتبت محدث ہونے کے لیے ایوب سختیانی، شعبہ بن الحجاج، امام مالک اور یحییٰ بن سعید قطان کی شہادت ہی کافی ہے، جن کے بارے میں امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھا ہے:

وما علمنا أحداً من أئمة السلف، ممن يستعمل الأخبار ويتفقد صحة الأسانيد وسقمها، مثل أيوب السختياني، وابن عون، ومالك بن أنس، وشعبة بن الحجاج، ويحيىٰ بن سعيد القطان، وعبدالرحمن بن مهدي ومن بعدهم من أهل الحديث، فتّشوا عن موضع السماع في الأسانيد[1].

یعنی ان ائمہ سلف میں سے جو حدیثوں میں مشغول رہے ہیں، اور سندوں کی صحت وسقم کی چھان بین کی ہے، ہم کسی کو نہیں جانتے کہ ایوب سختیانی، ابن عون، مالک بن انس، شعبہ بن الحجاج، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی اور ان کے بعد کے محدثین کی طرح سندوں میں سماع کے مقام کی تلاش وجستجو کی ہو۔

بلکہ کسی راوی کے ثقہ اور قابل اعتماد ولائق اعتبار ہونے کے لیے ان ائمۂ فن اور حفّاظِ حدیث میں سے ایک دو کی شہادت بھی کافی ہوسکتی ہے، تو اس شخص کے اعتماد واعتبار اور مقام ومرتبہ کا کیا کہنا، جس کے علم وفضل اور تفقہ کی تعریف وتوصیف نہ صرف یہ سب حضرات مل کر بلکہ ان جیسے بے شمار افراد کرتے ہوں۔ اور تعریف وتوصیف تو درکنار اس زمانے کے کتنے ائمہ اور محدثین کے نام ہم کو تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں، جو امام اعظم کے فقہ واجتہاد پر عمل کرکے ان کے مقلدین کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔ یہاں صرف نمونہ کے طور پر چند ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

باقی آئندہ

---

(۱) مقدمۂ صحیح مسلم: ۳۲.

تحریر: حمد محمد العریان　　ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی، شارجہ

یزید بن معاویہؓ

ضمیمے

یزید کی حمایت اور مخالفت میں لکھی جانے والی کتابیں

☆**الکلام فی سیدنا معاویہ و ابنہ یزید**، از: خفاجی

سوانح، مخطوطہ نمبر ۱۷۹۷، ادب ص: ۲۵۶

(۱) تیموریہ، **دار الكتب القومية** (قاہرہ)

☆ **فهرس الفتاوى الحديثية، لابن حجر الهيتمي.**

مخطوطہ نمبر ۱۶۹۔ معالم

☆**الجزء المعلم بتحريم لعن المسلم.**

نمبر ۷۸۰، فقہ، تیموریہ

یہ رسالہ یزید پر لعنت کے عدم جواز میں ہے

التذكرة التيمورية، ص: ۴۴۶

☆ **كتاب في يزيد بن معاوية، از: محمد بن أحمد بن الأزهر الأزهري الهروي**

اس کے مصنف لغت کے ماہر اور ادیب و مورخ ہیں، خراسان کے شہر ہرات میں ۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے، فقہ کی تحصیل کی، پھر ان پر عربی ادب کا غلبہ ہوا اور اس کی طلب میں انھوں نے مختلف قبائل کا قصد کیا، اور اس کا وسیع علم حاصل کیا۔ ہرات میں ربیع الآخر ۳۷۰ھ میں وفات پائی۔

☆**أخبار يزيد بن معاوية**، از: محمد بن العباس الیزیدی البغدادی

ادیب، تاریخ دان اور ایک بڑے راوی ہیں، ان کی وفات جمادی الآخرہ ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ ان کی ایک کتاب **أخبار اليزيدين** بھی ہے۔

☆خبر يزيد بن معاوية. از: ابن حزم۔

جوامع السيرة، ص: ٣٥٧.

☆ترجمة يزيد بن معاوية

تاريخ دمشق: ١٢٤/١٨، نمبر۳۳۸۲، المكتبة الظاهرية: دمشق.

مکتبۂ مخطوطات، جامعۃ الکویت، میں اس مخطوطے کا فوٹو موجود ہے، اور جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی، الکویت کے مرکز المخطوطات والتراث والوثائق میں بھی اس کتاب کا فوٹو ہے۔

☆الهاوية في تاريخ يزيد بن معاوية، از: حسین بن احمد بن اسماعیل بن زین العابدین البراقی النجفی ۱۲۶۱-۱۳۳۲ھ/۱۸۴۵-۱۹۱۳م

☆ قيد الشريد من أخبار يزيد، از: ابن طولون، تحقیق: محمد زينهم القاہرۃ، ۱۴۰۸ھ-۱۹۸۷م

☆يزيد بن معاوية، از عمر بن أبي النصر

اس کا اختصار چھپ چکا ہے۔

”زوجۂ یزید“

یزید نے حریث بن عبدالملک کی لڑکی سے شادی کی تھی (الإصابة، ابن حجر: ٣٧٦/١)

یزید کے خلاف خروج کی دعوت

☆ شبث بن ربعي:

اس نے حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کو یزید کے خلاف خروج کی دعوت دی تھی (البداية والنهاية: ١٥١/٨)

☆ عبد الله بن حنظلة:

انھوں نے یزید بن معاویہ کے خلاف خروج کیا تھا (البداية والنهاية: ٢١٥/٨، ٢١٦)

یزید اور ابن زبیر (رضی اللہ عنہما)

عبداللہ بن الزبیر صحابی اور یزید بن معاویہ (رضی اللہ عنہم):

البداية والنهاية: ٣٢/٨، ٣٣٦، ٢٢٤، ٢٦١، ٣٣٩، ٣٤٠.

یزید کے پاس وفد کی آمد

☆ عبداللہ بن جعفر بن اَبی طالب (رضی اللہ عنہما) کی یزید کے پاس وفد کی حیثیت سے آمد (البداية والنهاية: ٢٣٠/٨)

☆ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) حضرت عبداللہ بن جعفر (رضی اللہ عنہما) کو سال میں دس لاکھ عطا فرماتے تھے، اور جب وہ یزید کے پاس آئے تو یزید نے انھیں بیس لاکھ عطا فرمایا، اور کہا کہ خدا کی قسم آپ کے علاوہ کسی کو بھی اتنا نہیں دوں گا۔

سير أعلام النبلاء: ٣٩/٤

☆ تاریخ الاسلام: ٩٢/٣ میں مصنف کے الفاظ یہ ہیں کہ:...... جب عبداللہ بن جعفر یزید کے پاس آئے تو اس نے انھیں دس لاکھ عطا کیا، تو عبداللہ نے اس سے کہا کہ: میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، تو اس نے انھیں مزید دس لاکھ دینے کا حکم دیا، تو عبداللہ نے اس سے کہا کہ: خدا کی قسم اب تیرے بعد میں کسی کے لیے یہ جمع نہیں کروں گا (تمھارے بعد کسی کو بأبي و أمي نہیں کہوں گا)

سير أعلام النبلاء، حاشية: ٣٩/٤

واقعۂ حرہ

☆ ٦٢ھ میں پیش آیا۔ البداية والنهاية: ٢٣٤/٦، ٢١٥/٨، ٢١٦، ٢١٧، ٢٢٠

☆ واقعۂ حرہ کے دن مسجد نبوی ﷺ میں اذان نہیں دی گئی (سنن الدارمي: ٤٤/١) بروایت سعید بن عبدالعزیز

☆ روح بن زنباع الجذامي:

٦٢ھ میں اہل حرہ سے اس کا قتال کرنا (البداية والنهاية: ٢١٨/٨)

یزید کے بارے میں آراء

(امام) ذہبی کی رائے:

یزید ان لوگوں میں سے ایک ہے جس سے ہم نہ محبت رکھتے ہیں نہ اس کو برا بھلا کہتے ہیں، وہ اموی اور عباسی اور مختلف علاقوں کی حکومتوں کے بادشاہوں کی طرح ہے، بلکہ ان میں بعض اس سے

بھی بدتر ہیں، اس کا معاملہ اس وجہ سے اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ وہ نبی ﷺ کی وفات کے جلد ہی بعد یعنی صرف ۴۹ سال کے بعد زمام حکومت سنبھالتا ہے جبکہ ابھی صحابۂ کرامؓ موجود تھے، مثلاً ابن عمر رضی اللہ عنہ جو اس سے، اس کے والد اور دادا سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے[1] سیر أعلام النبلاء: ٣٦/٤.

علامہ محمد کرد علی کی رائے:

......مسعودی نے یزید بن معاویہؓ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اور جس کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی، اگر ہم اس کے بعض حصے پر بھی نگاہ ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ انھوں نے معتبر مؤرخین کی مخالفت کرتے ہوئے شیعیت کی بھرپور خدمت کی ہے (کنوز الأجداد: ١٠٨)

مؤرخ ابن کثیر کی رائے:

......ابن عساکر نے یزید بن معاویہؓ کی مذمت میں چند حدیثیں ذکر کی ہیں، وہ سب کی سب موضوع ہیں، ان میں سے ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ معتبر روایتیں وہ ہیں جن کو ہم نے ان کی سندوں کی کمزوری اور بعض کے انقطاع کے باوجود ذکر کیا ہے، واللہ أعلم[2]۔

یزید کا حدیث روایت کرنا

☆ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: یزید نے اپنے والد حضرت معاویہؓ سے یہ حدیث روایت

---

(۱) ذہبی کے اس کلام میں یزید پر بلا وجہ کی شدت نظر آتی ہے، بالخصوص جبکہ انھوں نے عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کے مستحق خلافت ہونے کا ذکر کیا، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ انھوں نے خلافت سے انکار کر دیا تھا، اور اپنی اولاد کو بھی اس کی تاکید کی تھی، اور جب انھوں نے (ان کی اولاد نے) یزید کی بیعت کو توڑنا چاہا تو انھیں فہمائش کی تھی اور ان کو آنحضرت ﷺ کی حدیثیں سنائی تھیں، جیسا کہ رسالہ کے شروع میں یزید کے حالات میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں یزید کے حالات زندگی میں بعض ایسی منکر روایتیں بھی ذکر کی ہیں جیسے وہ مسلمات میں سے ہوں، اور یہ مناسب نہیں ہے، کیونکہ یزید کے اندر اگر خرابیاں ہیں تو اس کے اندر اچھائیاں بھی ہیں، اس لیے جو باتیں اس کے بارے میں درست نہیں ہیں ان کی طرف میلان بہتر نہیں ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یزید کے بیشتر سوانح نگاروں کا خواہ وہ قدیم ہوں، یا جدید، ان تحریروں کی طرف میلان ہے جو ان کے پیش رو علما نے لکھ دی ہیں، جس کا ثبوت وہ خیالات اور عبارتیں ہیں جو ہم نے اس رسالے میں نقل کی ہیں۔

(۲) ابن کثیر کے اس کلام سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی کے پاس یزید کی مذمت کی نسبت کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، بجز ان موضوع، ضعیف اور منقطع روایتوں کے، اس لیے حق یہ ہے کہ یزید کی مذمت کے سلسلے میں توقف سے کام لیا جائے، جب تک کہ مذمت کی روایت ثابت نہ ہو جائے۔ اور اسی لیے بقول امام غزالی اس کے لیے رحمت کی دعا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں میں شامل ہے، واللہ عزوجل أعلم۔

کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ”مَن یُرِدِ اللّٰہُ بِہِ خَیراً یُفَقِّھُهُ فِي الدِّینِ“ اللہ تعالی جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا علم عطا فرما دیتا ہے۔

☆ ایک دوسری حدیث وضوء کے بارے میں روایت کی ہے، جس کی روایت یزید سے ان کے بیٹے خالد، اور عبد الملک بن مروان کرتے ہیں۔ اور ابو زرعہ دمشقی نے یزید کا ذکر اس طبقہ میں کیا ہے جو طبقۂ صحابہ سے نیچے کا ہے، اور وہ بلند طبقہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس کی روایت کردہ متعدد احادیث ہیں (البداية والنهاية: ٢٢٦/٨)

قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکر کے لیے نبی ﷺ کی خوش خبری

امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ”أول جیش من أمتي یغزون مدینة قیصر مغفور لهم.“ [(١)] میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگا اس کی مغفرت ہو جائے گی۔

یزید بن معاویہؓ کے بارے میں متعدد اقوال:

☆ عمرو بن قیس کہتے ہیں کہ انھوں نے یزید کو برسر منبر یہ کہتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالی چند لوگوں کے گناہ کی وجہ سے تمام لوگوں کی گرفت نہیں کرتا، الا یہ کہ برائی عام ہو جائے اور اسے دور نہ کیا جائے، تو پھر سب کی گرفت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن ہمام نے یزید کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ: امیر المؤمنین اللہ تعالی آپ کو مصیبت پر اجر اور عطیہ میں برکت عطا فرمائے، رعایا کے سلسلہ میں آپ کی مدد کرے، یقیناً آپ پر بڑی مصیبت آئی ہے، اور آپ کو خوب نوازا بھی گیا ہے، اس لیے آپ صبر سے کام لیجئے اور شکر ادا کیجئے۔ آپ امت کی نگہبانی کر رہے ہیں، اللہ تعالی آپ کی حفاظت فرمائے (سیر أعلام النبلاء: ۴/ ۳۷)۔

(١) بخاری: ۴/ ۵۱ میں ام حرام بنت ملحان سے اس حدیث کا تکملہ یہ ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: أول جیش من أمتي یغزون البحر قد أوجبوا، تو انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں بھی ان میں سے موجود ہوں گی، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں، پھر نبی ﷺ نے فرمایا کہ: ”أول جیش من أمتي یغزون مدینة قیصر مغفور لهم“ تو پھر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں بھی ان میں ہوں گی، تو آپ نے جواب دیا کہ نہیں۔ اور یہ اس لئے کہ ام حرام بنت ملحان معاویہ بن ابوسفیان کے ساتھ پہلے لشکر میں شہید ہو گئیں اور انھیں وہیں دفن کر دیا گیا، یعنی موجودہ قبرص میں، وہاں ان کی قبر مشہور ہے، اور وہ یزید کے اس لشکر میں شریک نہیں ہو سکیں۔ اور یہ نبوت کے دلائل میں سے ایک عظیم الشان دلیل ہے۔

☆ اپنے والد کی وفات کے بعد[1] نماز ظہر پڑھانے کے لیے آئے، تو اس حال میں آئے کہ غسل کیا تھا اور صاف ستھرے لباس پہن رکھے تھے، نماز سے فارغ ہو کر منبر پر بیٹھے اور خطبہ دیا اور فرمایا کہ: میرے والد تمہیں سمندری جنگ کے لیے تیار کر رہے تھے، لیکن میں تمہیں سمندری مہم پر نہیں بھیجوں گا، وہ تمہیں سردی میں سرزمین روم پر قیام کراتے تھے، لیکن میں تمہیں دشمن کی سرزمین پر سردی کے موسم میں نہیں روانہ کروں گا، وہ عطایا تین حصوں میں تقسیم کیا کرتے تھے لیکن میں یکجا دیا کروں گا، یہ باتیں سن کر یزید کی تعریف کرتے ہوئے لوگ رخصت ہوئے (سیر أعلام النبلاء: ۴/۳۷)۔

☆ ذہبی (رحمہ اللہ) کہتے ہیں کہ: یزید کے اندر جہاں کچھ خرابیاں تھی، وہیں اس کی ایک بڑی نیکی بھی ہے، اور وہ ہے قسطنطنیہ پر لشکر کشی، جس کی قیادت یزید کے ہاتھ میں تھی، اس لشکر میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ جیسے لوگ شامل تھے (سیر أعلام النبلاء: ۴/۳٦)۔

☆ شبّاک بن عائذ القیسی کہتے ہیں کہ عمرو الحزور الجریری نے نہیک بن عمرو القیسی کے واسطے سے ہمیں یہ خبر دی کہ: ہم یزید بن معاویہؓ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ رے شہر میں ان کے مکان پر بطور سائبان کے پردہ لگا ہوا ہے، پھر ایک منادی نے آواز لگائی کہ اہل بصرہ کا وفد کہاں ہے؟ امیر المؤمنین نے تمہارے لیے اتنے اور اتنے عطیہ کا حکم دیا ہے۔ پھر دوسرے منادی نے آواز دی کہ اہل بصرہ کا وفد کہاں ہے؟ تمہارے لیے یہ حکم دیا ہے۔ اس طرح تین مرتبہ منادی کی گئی، ہم نے آپس میں کہا کہ ہمارا خیال ہے کہ وہ بیٹھا پی رہا ہے، اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس نے پردے کے کنارہ کو ہٹا دیا، تو ہم نے دیکھا کہ وہ بیٹھا قرآن پڑھ رہا ہے (التاریخ الکبیر: ۴/۲۷۰)۔

پہلا شخص جس نے خانۂ کعبہ کی خدمت کی

☆ کہا جاتا ہے کہ یزید وہ پہلا شخص ہے جس نے خانۂ کعبہ کی خدمت کی اور اس پر خسروانی ریشم کا غلاف چڑھایا۔

یزید کے عہد میں مفتوحہ ممالک

☆ مغرب اقصی: جو سپہ سالار حضرت عقبہ بن نافعؓ کے ہاتھوں فتح ہوا۔

☆ بخاریٰ اور خوارزم: ان دونوں شہروں کو مسلم بن زیاد نے فتح کیا۔

---

(۱) یعنی ان کی تدفین کے بعد۔

جبل قاسیون میں یزید کے نام پر ایک نہر

☆ دمشق کی ''نہر یزید'' اسی کی طرف منسوب ہے، یہ پہلے ایک چھوٹی نہر تھی جو دمشق کے دو کناروں کو سیراب کرتی تھی، یزید نے اس کی توسیع کی تو اسی کے نام سے منسوب ہوگئی۔

یزید کی نسل:

تاریخ مانوزی کے مصنف کے ذاتی نسخے کے حصۂ ششم میں یہ مذکور ہے کہ یزید کی نسل مغرب اقصی کے علاقے سوس میں تازونت کی سمت میں اب تک چلی آرہی ہے، جو بنی یزید کے نام سے مشہور ہے، اور تقریباً دوسو خاندان پر مشتمل ہے۔ ان کے بزرگوں نے اندلس سے چوتھی صدی ہجری میں اس وقت نقل مکانی کی جب وہاں ان کے اہل خاندان بنومروان کی حکومت کمزور ہوگئی، اس خاندان میں اہل علم بھی ہیں، سوس میں ان کا ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی ہے۔

یزید کی اولاد، ان کی تعداد اور ان کی مائیں

۱- یزید کی اولاد میں سے معاویہ بن یزید ہیں، جن کی کنیت ابولیلی تھی، انھیں کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

إني أرى فتنة قد حان أولها   والملک بعد أبي ليلى لمن غلبا

میں دیکھتا ہوں کہ فتنہ کی ابتدا ہو چکی ہے   اب جو غالب آئے گا ابولیلی کے بعد حکومت اسی کی ہوگی

۲- خالد بن یزید: جس کی کنیت ابوہاشم تھی، کہا جاتا ہے کہ اسے علم کیمیا حاصل تھا۔

۳- ابوسفیان: ان دونوں کی ماں ام ہاشم بنت ابوہاشم بن عتبہ بن ربیعہ بن عبدشمس تھیں، اور ان سے مروان بن الحکم نے شادی کی تھی، انھیں کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

أنعمي أم خالد   ربَّ ساعٍ كقاعد

۴- عبدالعزیز بن یزید: انھیں ''اسوار'' بھی کہا جاتا ہے، وہ عرب کے بڑے تیراندازوں میں تھے، ان کی والدہ کا نام کلثوم بنت عبداللہ بن عامر تھا، انھیں کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

زعم الناس أن خير قريش   كلِّهم حين يذكرون الأساورُ

لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر تمام قریش کا ذکر کیا جائے تو ان میں بہترین شخص اساور ہے۔

۵- عبداللہ الاصغر   ۶- ابوبکر   ۷- عتبہ   ۸- عبدالرحمٰن

۹-الربیع ۱۰-محمد

یہ سب مختلف ام ولد کے لڑکے تھے۔

۱۱-یزید ۱۲-حرب ۱۳-عمر ۱۴-عثمان

یہ چودہ تو لڑکے تھے، اور لڑکیاں پانچ تھیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۵-عاتکہ ۱۶-رملہ ۱۷-اُم عبدالرحمٰن ۱۸-اُم یزید ۱۹-اُم محمد

یزید کی زبان سے نکلنے والی آخری بات

عبدالرحمٰن بن ابی مدعور کہتے ہیں کہ مجھ سے بعض اہل علم نے بیان کیا کہ: یزید بن معاویہؒ کی زبان پر جاری ہونے والا آخری کلام یہ تھا:

اللهم لا تؤاخذني بما لم أحبه، ولم أرده، واحكم بيني وبين عبد الله بن زياد.

یعنی اے اللہ تو ان چیزوں پر میری گرفت نہ فرما جنھیں میں نے نہ پسند کیا، اور نہ جس کو چاہا، اور میرے اور عبداللہ بن زیاد کے درمیان فیصلہ فرما۔

یزید کی انگشتری کا نقش:

☆اس کی انگوٹھی کا نقش تھا "**آمنت بالله العظيم**" (البداية والنهاية: ۱۳٦/۸)

یزید بن معاویہ نامی علماء وحکام اور ان کی روایت کردہ بعض حدیثیں

☆يزيد بن معاويه البكّائي: تهذيب التهذيب: ۱۱/۳۷۰، كتاب تلخيص المتشابه في الرسم، للخطيب: ۱/۵۰۷

ان کا شمار کوفیوں میں ہوتا ہے، انھوں نے حذیفہ بن الیمان (رضی اللہ عنہ) سے حدیث بیان کی ہے، اور ان سے ایاد بن لقیط نے روایت کی، مصنف کہتے ہیں کہ ہمیں ابوالحسن احمد بن محمد بن احمد بن صلت اھوازی نے خبر دی، اور انھوں نے ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید الہمدانی سے سنا، انھوں نے احمد بن عبدالحمید الحارثی سے، اور ان سے ابو اسامہ نے بیان کیا، انھوں نے عبدالرحمٰن سے اور عبدالرحمٰن نے عبدالملک بن ابجر سے، اور انھوں نے اپنے والد سے، اور ان کے والد نے ایاد بن لقیط کے واسطے سے یزید بن معاویہ البکائی سے بیان کیا کہ: "میں حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) کے پاس بیٹھا تھا کہ انھوں نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو اللہ تعالی نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا،

پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ کو، پھر ان کا بھی انتقال ہوگیا تو عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا''۔

اس حدیث کی روایت ابوجعفر حضرمی مطین، اور علی بن محمد بن صاعد نے احمد بن عبدالحمید سے کی ہے، عبداللہ بن محمد بن جعفر القزوینی نے ان کی مخالفت کی ہے، اور (یزید بن معاویہ) کے بجائے زید بن معاویہ بغیر ''ی'' کے ذکر کیا ہے۔

اور ابوسعید ابن الاعرابی نے کبھی یزید اور کبھی زید کہا۔

قزوینی کہتے ہیں کہ: میں نے ۲۶۴ھ میں عبد اللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ حدیث ذکر کی تو انھوں نے فرمایا کہ: آج کوفہ میں اس سے بہتر حدیث کا مجھے علم نہیں ہے۔

☆ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد یزید بن معاویہ النخعی [۱] (۳۲ھ-۶۵۲م)

التاريخ الكبير: ۳۵٥/۸، **الجرح والتعديل:** ۲۸٦/۹، **تهذيب الكمال:** ۱٥٤۳، **تهذيب التهذيب:** ۳٦۰/۱۱، **تقريب التهذيب:** ۳۷۱/۲، **الأعلام:** ۱۸۹/۸، **الخلاصة:** ۱۷۷/۳

ابووائل شقیق بن سلمہ نے ذکر کیا ہے کہ یزید بن معاویہ نخعی ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) کے اس قدر قریب تھے کہ ان کے واسطے حضرت ابن مسعود سے اجازت لیا کرتے تھے، لیکن خود ان کی روایت کا مجھے علم نہیں ہے۔

ہمیں ابوعبداللہ محمد بن محمد بن علی الفارسی نے خبر دی، انھوں نے ابوعمر اور محمد بن ابوجعفر حربی سے سنا، انھوں نے ابویعلی یعنی موصلی سے جو ابن معین کہلاتے ہیں، اور انھوں نے ابومعاویہ سے، انھوں نے اعمش سے اور وہ یزید بن معاویہ نخعی سے بیان کرتے ہیں کہ: دنیا بہت مختصر بنائی گئی ہے، اور اس میں سے بھی بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔

(۱) بلنجر کی جنگ میں شریک تھے اور انھوں نے ترکوں اور خزر سے جنگ کی ہے۔
زرکلی کہتے ہیں کہ: میں نے صحیح البخاری کے ''باب الموعظۃ ساعۃ بعد ساعۃ'' کے حاشیہ میں جس کا ایک قدیم مخطوطہ میرے پاس ہے، اس میں یہ عبارت پڑھی ہے کہ: یزید بن معاویہ یمنی اور کوفی ہیں، یہ بات ابوذر رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ اور ابو محمد المنذری نے ابن طاہر کی کتاب کے حاشیہ میں یہ لکھا ہے: یزید بن معاویہ تابعی نخعی ہیں، اور ابن مسعود کے ساتھیوں میں ہیں، فارس میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ (کذا)

سعید بن منصور نے بیان کیا، انھوں نے ابومعاویہ سے سنا، انھوں نے اعمش سے اور وہ عمارہ بن عمیر سے روایت کرتے ہیں کہ: ہم نے ایک لشکر کے ساتھ فارس کا سفر کیا۔ اس لشکر میں علقمہ بن قیس، معضد عجلی، یزید بن معاویہ نخعی اور عمرو بن عتبہ بن فرقد بھی تھے، ہم نے ایک محل کا محاصرہ کیا۔ ہمارا ایک ساتھی بیمار تھا، اس کے لیے ہم نے قبر کھودی۔ یزید بن معاویہ نے خواب دیکھا کہ وہ ایک سفید ہرنی کے ساتھ اس قبر میں دفن کر دیے گئے۔ یزید ہلکے پھلکے اور سفید گورے چٹے تھے، نیا اور سفید جبہ پہن کر وہ قصر کے پاس آنے جانے لگے، اور کہنے لگے کہ اس جبہ پر خون کا ڈھلکنا کتنا خوبصورت لگے گا، اتنے میں ان پر ایک پتھر گرا اور وہ شہید ہو گئے، ہم نے انھیں دفن کر دیا۔

☆ یزید بن معاویہ بن ابی سفیان:

۲۵-۶۴ھ = ۶۴۵-۶۸۳م

یزید سے ان کے لڑکے نے روایت کی ہے۔

ہم سے ابوالحسین بن محمد بن علی بن محمد بن مخلد الوراق نے اپنی اصل کتاب سے پڑھ کر بیان کیا، اور ہم نے اس کو ان کے علاوہ کسی اور سے نہیں سنا، کہا کہ ہمیں احمد بن محمد بن عمران نے خبر دی، اور انھیں عمر بن عبدالعزیز نے، اور انھیں دینار فارسی نے، انھیں ابوعلانہ محمد بن عمرو بن خالد نے، انھیں عبد اللہ بن لہیعہ نے، کہا کہ: ''مجھ سے حارث بن یزید حضرمی نے بیان کیا، کہا کہ مجھ سے علی بن رباح لخمی نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے خالد بن یزید بن معاویہ نے بیان کیا کہ: مجھ سے میرے والد نے کہا کہ مجھ سے عمرو نے بیان کیا، میں نے دریافت کیا کہ آپ سے کیا بیان کیا؟ فرمایا کہ: میں نے انھیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ: قریش کے تین آدمی تمام لوگوں سے زیادہ خوبصورت، اور سب سے زیادہ بلند اخلاق تھے، جو نہ جھوٹ بولتے تھے، اور نہ کسی کو جھوٹا کہتے تھے، وہ ہیں: ابوبکر الصدیق، عثمان بن عفان، اور ابوعبیدہ بن الجراح۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

فرمایا کہ: قریش کے دو شخص جو ہر بھلائی اور برائی کو تاڑ جانے والے تھے، عمر بن الخطاب اور معاویہ بن ابوسفیان (رضی اللہ عنہما) تھے۔

خالد بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو یہ ذکر کرتے ہوئے سنا کہ انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور اللہ تعالی نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو

خلیفہ بنایا تو وہ جسمانی لحاظ سے تو کمزور تھے، لیکن اللہ تعالی کے معاملہ میں بڑے سخت تھے، پھر عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تو وہ بڑے قوی اور امانت دار تھے، پھر عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا، تو وہ بڑے نرم دل لیکن لوگوں کے معاملہ میں سخت تھے، چنانچہ ان کے خلاف بغاوت ہوئی، اور وہ ظلم وزیادتی کے ساتھ شہید کردیے گئے، میں شام کے لوگوں کے ساتھ ان کے قصاص کے لئے نکلا، ان کے لشکر کی تعداد کم اور ان کے پاس سرمائے کی کمی تھی، اللہ تعالی نے میری مدد فرمائی، عربوں نے ہماری طرف رجوع کیا، میرے لیے مال جمع کرنے اور ان لوگوں پر تقسیم کرنے کا مسئلہ تھا جن پر وہ (عثمان رضی اللہ عنہ) تقسیم کیا کرتے تھے۔

آج مجھے عربوں کے چہروں پر فتنہ نظر آرہا ہے، میں مرگیا تو یہ دوفرقوں میں بٹ جائیں گے، اور ان دونوں میں سے ایک فرقہ وہ ہوگا جو مال ودولت جمع کرے گا، حکومت واقتدار کو پھیلائے گا، اور مال ودولت کا مالک بن کر جسے چاہے گا دے گا، اور جسے چاہے گا محروم کرے گا، جو شخص کسی حصہ کا والی اور حاکم ہوگا اسی پر اکتفا کرے گا، یا وہ اس کے لیے کافی ہوگا۔

☆ یزید بن معاویہ، ابو شیبہ الکوفی:

الجرح والتعدیل: ۲۸۷/۹، تهذیب الکمال: ۱۰۴۳، تهذیب التهذیب: ۲۶۰/۱۱

یہ عبد الملک بن عمیر، سلیمان اعمش، اور عاصم بن بہدلۃ سے روایت کرتے ہیں، اور ان سے سعید بن منصور اور جبارۃ بن مغلس نے روایت کی ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ مجھے علی بن احمد الرزاز نے خبر دی، انھیں ابوبکر محمد بن الحسن بن مقسم العطار نے، انھیں موسی بن اسحاق قاضی انصاری، محمد بن عثمان اور محمد بن لیث الجوہری نے -مگر روایت کے الفاظ قاضی کے ہیں- کہا کہ ہمیں جبارۃ نے خبر دی اور انھیں یزید بن معاویہ نے اعمش کے واسطہ سے ابو صالح سے، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "ألا أدُلُّكَ عَلَى كَنْزٍ مِّنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ؟ لا حَوْلَ وَلا قُوَّةَ إلا بِالله." کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ کا پتہ نہ بتاؤں کہ وہ ہے 'لا حول ولا قوة إلا بالله۔ اللہ کی توفیق کے بغیر کوئی طاقت وقوت نہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں (۱):

---

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم، طبعة الریاض ١٤٠٤ھ، ١/٢٠٤، ٢٠٥، ٢٠٦.

''......نیز عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے، جو سینہ کوبی کرے، گریبان چاک کرے، اور جاہلیت کا نعرہ لگائے۔''[۱]

جاہلیت کا نعرہ مردے کے محاسن بیان کر کے رونا، اور عصبیت کا مظاہرہ کرنا بھی ہے۔ اور اسی معنی میں آنحضرت ﷺ کا وہ فرمان ہے جسے امام احمد (رحمہ اللہ) نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: **''من تعزى بعزاء الجاهلية فأعضوه بهن أبيه، ولا تكنوا.''**[۲] یعنی جو جاہلیت کے الفاظ سے تعزیت کرے، یعنی **یا بنی فلان**، **یا یالفلان** کہے تو اس سے کہو کہ اس کے باپ کے نام کا۔۔۔ذکر کرو، اشارے و کنایہ سے کام نہ لو۔

نیز ابو مالک الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''میری امت میں چار کام جاہلیت کے ہیں، جن کو وہ چھوڑیں گے نہیں: حسب اور خاندانی شرافت پر فخر کرنا، نسب میں طعنہ زنی کرنا، ستاروں سے پانی طلب کرنا، اور نوحہ خوانی کرنا'' اور فرمایا کہ: ''نوحہ کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کرے گی تو قیامت کے دن اسے گندھک کا کرتا اور خارش کی زرہ پہنائی جائے گی''۔[۳]

آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں اس شخص کی مذمت کی ہے، جو رسوم جاہلیت کی دعوت دیتا ہے، اور آپ نے یہ خبر بھی دی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے کچھ کام ایسے ہیں جن کو تمام لوگ نہیں چھوڑیں گے، اس میں اس کام کو نہ چھوڑنے والوں کی مذمت کا پہلو موجود ہے۔ ان تمام باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ جو کام اور اعمال زمانۂ جاہلیت کے ہیں، وہ سب مذہب اسلام میں مذموم ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ان منکرات کو جاہلیت کی طرف منسوب کرنے سے ان کا مذموم ہونا لازم نہ آتا، جبکہ یہ بات واضح ہے کہ ان منکرات کی جاہلیت کی طرف اضافت کا مقصد ہی ان کی برائی کو ظاہر کرنا ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾[۴] (اور جاہلیت قدیم کے مطابق اپنے کو دکھاتی مت پھرو) چنانچہ اس آیت میں تبرج کی بھی مذمت ہے اور جاہلیت قدیم کے حالات کی بھی۔ اور یہ مذمت فی الجملہ اہل جاہلیت کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کی مخالفت کی متقاضی ہے۔

---

(۱) متفق عليه. خ: ۱۶۳/۳، م ۹۹/۱.

(۲) رواه أحمد: ۱۳۶/۵ وهو صحيح.

(۳) مسلم: ۶۴۴/۲.

(۴) الاحزاب: ۳۳

خلاصۂ بحث:

اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقی مسلمان اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اللہ تعالی اس سے حضرت علی اور معاویہ، یا یزید وحسین وغیرہ (رضی اللہ عنہم) یا ان کے بعد آنے والوں کے باہمی اختلافات کے بارے میں سوال نہیں کریں گے، بلکہ بندوں سے ان کے ان کاموں کی باز پرس ہوگی جوانھوں نے آگے بھیجے یا پیچھے چھوڑے ہیں۔ چنانچہ متقی وپرہیزگار انسان اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کے گناہوں کی تلاش میں نہیں رہتا، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''يُبْصِرُ الْقَذَاةَ فِي عَيْنِ أَخِيهِ وَيَنْسَى جِذْعَ النَّخْلَةِ فِي عَيْنِه.'' [۱] انسان کو اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے، اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

غرض وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، جیسا کہ ہمارے رب کا ارشاد ہے: ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ، وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [۲] **یہ ایک** جماعت ہے جو گزر چکی ہے، ان کا کیا ہوا ان کے آگے آئے گا، اور تمہارا کیا ہوا تمہارے آگے آئے گا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی۔

لیکن کیا جس کے دل، کان اور نگاہ پر پردہ پڑ چکا ہو، اور اللہ تعالی نے جس کے راستے کو تاریک کر دیا ہو، اور وہ نہ دیکھتا ہو، نہ روشن دلائل کو سمجھتا ہو، اُس کا کوئی علاج ہے؟

ہم اللہ تعالی سے ہدایت اور قلب سلیم کے طلب گار ہیں، اور ہر حال میں اس کی حمد وثنا کرتے ہیں۔

وصلاته وسلامه على نبيه وصفوة خلقه وآله وصحبه وسلم تسليماً كثيرا.

كتبه لكم

محمد ابراهيم الشيباني

٥١٤٣٤/١٢/١٧

٢٠١٣/١٠/٢٢م

---

(۱) حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں: ''**يبصر أحدكم القذاة في عين أخيه وينسى الجذع أو الجدل في عينه معترضاً.**'' ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو بیان کیا ہے، اور ابونعیم نے حلیہ: ٤/٩٩ میں۔ دیکھئے: **الأحاديث الصحيحة**: ٤٢/١.

(۲) **البقرة**: ١٣٤

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

مولانا زبیر الحسن کاندھلوی

۱۶ر جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ = ۱۸ر مارچ ۲۰۱۴ء کو دو پہر کے وقت یہ ناگہانی اطلاع ملی کہ تبلیغی جماعت کے قافلہ سالار اور محترم بزرگ جناب مولانا زبیر الحسن کاندھلوی کا دہلی میں چند روزہ علالت کے بعد انتقال ہوگیا ہے، اس خبر سے جماعتی حلقوں کے علاوہ علمی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی، وہ خاندان کاندھلہ کے چشم و چراغ اور سرگرم داعی ومبلغ تھے، عمر عزیز قریب ۶۵ برس رہی ہوگی، لیکن خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمر کی اسی منزل میں جسمانی کل کے کئی پرزوں نے کام کرنا بند کردیا تھا، حالت جب زیادہ خراب ہوگئی تو دہلی کے کسی اسپتال میں داخل کیا گیا، جہاں انھوں نے دن کے تقریباً گیارہ بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہاإنا لله وإنا اليه راجعون.

مولانا مرحوم تبلیغی جماعت کے سابق امیر حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی نور اللہ مرقدہ (حضرت جی) کے فرزند ارجمند تھے، ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے، مظاہر العلوم سہارنپور سے فارغ التحصیل ہوئے، درس وتدریس کا مشغلہ رہا، تبلیغی جماعت کے دلی مرکز کے مدرسہ کاشف العلوم میں بھی درس دیتے تھے اور بخاری شریف پڑھاتے تھے۔

مولانا کے سانحۂ ارتحال سے نہ صرف دعوتی وتبلیغی بلکہ علمی اور تعلیمی وتدریسی حلقوں میں شدت سے خلا محسوس کیا جارہا ہے، اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، درجات کو بلند فرمائے، اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

پروفیسر محمود الٰہی

۱۷ر جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ = ۱۹ر مارچ ۲۰۱۴ء کی شام کو یہ افسوس ناک خبر ملی کہ اردو ادب کے معروف اسکالر اور مشہور محقق پروفیسر محمود الٰہی کی لکھنؤ میں وفات ہوگئی، إنا لله وإنا إليه راجعون.

پروفیسر محمود الٰہی ٹانڈہ کے باشندہ تھے، وہ ایک علمی ودینی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے

والد مولانا علیم اللہ رحمہ اللہ ٹانڈہ کے مشہور مدرسہ کنز العلوم کے ناظم رہ چکے تھے، انھوں نے اپنے دور نظامت میں اس کی تعمیر وترقی کے لیے انتھک جد وجہد کی، اوراس کو پروان چڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ پروفیسر محمود الٰہی کونشو ونما کے لیے جو ماحول ملا وہ علمی ودینی تھا، اوراس ماحول نے ان کی شخصیت اور ذہنی وفکری ساخت وپرداخت پر گہرا اثر ڈالا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ علم وتحقیق اورادب کی دنیا میں شہرت ونا موری کی انتہا تک پہنچنے کے بعد بھی ان کے اوپر دین ومذہب کا اثر نمایاں رہا۔

انھوں نے مدرسے کی تعلیم کے علاوہ اسکول کی تعلیم بھی حاصل کی، اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ ''اردو میں قصیدہ نگاری'' کے عنوان سے اردو زبان کے مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے زیر نگرانی ترتیب دے کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے ان کا جو رشتہ استوار ہوا، تو اس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک ان کا رشتۂ حیات منقطع نہیں ہو گیا۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ تک اردو زبان کی آبیاری اور علم وادب کی خدمت کی ہے، اور نہایت سادگی، دل جمعی اور بغیر کسی غرور وپندار کے یہ خدمت انجام دی ہے، تصنیف وتالیف کے ساتھ شاگردوں کی بھی ایک بڑی تعداد پیدا کی، ان کے فیض یافتہ بہت سے تلامذہ آج ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیوں اور جامعات میں اہم اور کلیدی عہدوں پر منصوب ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم ہوا، تو پروفیسر محمود الٰہی کو اس کے اولین استاد اور صدر شعبہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، اوراس وقت سے لے کر ۱۹۹۰ء تک انھوں نے اس شعبے کی سربراہی کی، ۱۹۹۰ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے، ۳۳ر سال کے اس طویل عرصے میں بہت سے رہروان علم وتحقیق نے ان سے کسب فیض کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کا علمی وتحقیقی سفر جاری رہا، تا آنکہ ان کی رحلت سے ادب وتحقیق کی بزم سونی ہوگئی، اور اردو ادب کی دنیا میں وہ خلا واقع ہوا ہے، جس کا آسانی سے پُر ہونا بظاہر مشکل نظر آ رہا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی نہایت سادہ مزاج، بے لوث اور شریف طبیعت کے آدمی تھے، سادگی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی تھی، غرور وپندار کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ان کے حقیقی بھائی ڈاکٹر محمد ظہور الحق صاحب مرحوم -متوفی ۲۰۰۷ء- میرے استاد ومربی تھے، اور پہلی بار غالباً ۱۹۹۶ء میں علی گڈھ میں انھیں کے فضیلت کدے پر پروفیسر محمود الٰہی صاحب سے ملاقات کا احقر کو شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں ان کی سادگی اور بے لوثی پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

ان کی فکر ونظر میں سلامتی اور سوچ مثبت تھی، بلیا ضلع میں ایک جگہ سکندر پور ہے، وہاں ایک علم دوست اور اردو زبان وادب سے محبت اور اسلامی تہذیب وثقافت سے دلچسپی رکھنے والے ڈاکٹر ڈی۔ این۔ چتر ویدی ہیں، انھوں نے بلیا کے صوفی شاعر آسی سکندر پوری-متوفی ۱۳۳۵ھ-پر ''تجلیات آسی'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے، چتر ویدی صاحب راقم الحروف سے ایک ملاقات میں کہنے لگے کہ میں نے جب ''تجلیات آسی'' لکھی تو اس پر مقدمہ لکھوانے کے لیے گورکھپور پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی خدمت میں گیا، انھوں نے کتاب دیکھ کر فرمایا کہ آپ کی کتاب میں کچھ صوفیانہ بحثیں بھی ہیں، ایسا نہ ہو کہ اسلامی تصوف سے تصادم کی وجہ سے آپ کی یہ کتاب متنازع بن جائے، اس لیے اس کی اشاعت سے پہلے کسی اچھے عالم دین سے اس پر نظر ثانی کرا لیجئے، چتر ویدی صاحب کو بھی یہ بات سمجھ میں آ گئی اور وہاں سے کتاب لے کر چلے آئے، واپسی کے بعد وہ حضرت مولانا الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور نظر ثانی کی درخواست کے ساتھ کتاب آپ کی خدمت میں حاضر کی، حضرت نے بعد میں دیکھنے کے لیے کہہ کر وہ کتاب رکھ لی اور کچھ دونوں کے بعد ان کو بلایا، اور نظر ثانی کر کے چند سطروں کی ایک تحریر بھی قلم بند فرمائی، اس سے پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی مثبت سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی، حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے علم وتحقیق کے معترف اور آپ کی تصانیف کے قدرداں تھے، راقم کو ان سے کئی بار ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، اور ہر ملاقات میں آپ کا ذکر خیر اور آپ کی تصانیف کی تحسین وستائش کرتے۔ علی گڈھ میں ان سے پہلی بار ملاقات یوں ہوئی کہ صبح کے وقت میرے استاد ڈاکٹر محمد ظہور الحق صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ بھائی صاحب آئے ہوئے ہیں، شام کے وقت گھر آ جاؤ تو ان سے تمھاری ملاقات کرادوں، راقم نے عصر کی نماز ان کے مکان سے قریب مسجد میں پڑھی اور اس کے بعد ان کے فضیلت کدے پر حاضر ہوا۔ عصر سے مغرب تک پروفیسر صاحب کے ساتھ صحبت رہی، نہایت شفقت ومحبت سے اس عاجز سے پیش آئے، علمی گفتگو کرتے اور ادب کے موتی بکھیرتے رہے، حضرت محدث الاعظمیؒ کے ساتھ جب احقر کی نسبت کا ان کو علم ہوا تو ان کی گفتگو کا محور زیادہ تر حضرت والا ہی کی ذات رہی، انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران فرمایا کہ انھیں کسی مخصوص شخصیت کے تذکرے کی ضرورت تھی، جس کے لیے انھوں نے مہینوں علی گڈھ اور ندوہ وغیرہ کے کتب خانوں کی خاک چھانی، سیر وسوانح اور تذکرہ وتاریخ کی بے شمار کتابیں الٹ پلٹ ڈالیں، مگر ان کی مراد بر نہ آئی اور جس چیز کی ان کو تلاش تھی اس کا کوئی سراغ نہ ملا، بالآخر انھوں نے

علامہ اعظمیؒ سے رجوع کیا، اور جو مشکل مہینوں کی محنت کے بعد بھی حل نہ ہوسکی، اس کی گرہ چشم زدن میں کھل گئی۔ راقم نے ''حیات ابوالمآثر'' کی ترتیب کے وقت پروفیسر صاحب کو خط لکھ کر اس واقعے کی تصدیق اور اس کے متعلق تحریر حاصل کرنی چاہی، تو انھوں نے از راہ کرم وہ پورا واقعہ تحریر فرما کر ارسال فرما دیا تھا، ان کا خط ''حیات ابوالمآثر'' جلد اول کے صفحہ ۴۷۷ پر درج ہے، خط کا متن حسب ذیل ہے:

''آپ نے علامۂ مرحوم کے جس علمی واقعہ کی یاد دلائی ہے، وہ یہ ہے کہ مجھے اردو میں ترجمۂ قرآن کی ایک جلد ملی تھی، میں اسے شمالی ہند میں اردو نثر کا نقطۂ آغاز سمجھتا تھا۔ اس کے مصنف یعنی مترجم کے حالات کہیں سے معلوم نہیں ہوئے۔ میں چاہتا تھا کہ اس پر طویل مضمون لکھوں، لیکن جب مترجم کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو تو قلم اٹھانا کچھ مستحسن نہیں تھا۔

ایک دن ڈاکٹر منور انجم مئو سے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ محدث جلیلؒ سے میرا سلام کہیے اور بعض نکات پر ان سے گفتگو کیجئے۔ میں نے تاکید کی تھی کہ ان کا جواب نوٹ کر لیجئے۔ وہ ملے اور میرا سوال نامہ ان کے سامنے رکھا تو فوراً جواب دیا کہ سلسلۂ مظہر جان جاناں کے اہل علم کا مطالعہ کروں، تو اس مصنف کا حال معلوم ہو جائے گا۔

حوالے کی کتابیں میرے پاس تھیں، میں نے منور صاحب کے تحریری جواب کی روشنی میں سلسلۂ مظہر جان جاناں کو کھنگالا تو منزل مقصود سامنے تھی، اس سے محدث جلیل کے تبحر علم اور علم الرجال میں ان کے غیر معمولی مطالعے کی کیفیت عیاں ہوتی ہے''

پروفیسر محمود الٰہی اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ کے چیرمین رہ چکے ہیں، اپنے عہدۂ صدارت میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ''البلاغ'' اور ''الہلال'' کے عکوس لے کر ۱۹۸۸ء میں تین ضخیم اور طویل جلدوں میں اکادمی کی طرف سے ان کو شائع کرایا، جو ان کا ایک یادگار علمی کام ہے، کہ انھوں نے علم و ادب کے اس بیش بہا ذخیرے کو محفوظ کر کے قابل استفادہ بنا دیا۔

افسوس ہے کہ علم و ادب کا اتنا بڑا شیدائی بزم اردو کو سونا کر گیا ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

خدا سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی حسنات اور علمی خدمات کو قبول فرما کر ان کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، اور ان کی لغزشوں کی پردہ پوشی فرمائے، آمین۔

یادگار ابوالمآثر

نتیجۂ فکر: مولانا عطاء الرحمٰن عطاؔ بھاگلپوری

وارث عظمت اکابر ہے — المآثر تو المآثر ہے
اس کے گلشن کی سیر تو کیجئے — واہ کیا خوب خوش مناظر ہے
راہ جنت کا رہنما یہ ہے — یہ مسیحائے دور حاضر ہے
ماشاء اللہ اس کا ہر مضموں — مستند گویا حرف آخر ہے
کتنا دلکش ہے کتنا جاں پرور — کیسا گنجینۂ جواہر ہے
جس سے دل کا مشام آسودہ — یہ وہی مشک بار عاطر ہے
اہل تحقیق کے لیے اس میں — بیش قیمت مواد وافر ہے
اہل دانش کی آنکھ کا سرمہ — اہل حق کا وکیل وناصر ہے
دیکھتے ہی یہ کھینچ لے دل کو — دیکھئے کیا حسین ساحر ہے
اُس سے بڑھ کر ہے دلنشیں باطن — جس قدر دلفریب ظاہر ہے
کیوں نہ عالی مقام ہو اس کا — یہ پسندیدۂ اکابر ہے
اہل دل کے سفر کا اک توشہ — ہمدم و رہبر مسافر ہے
یہ بہ فیضِ رشید اور مسعود — خوب وجہ سکون خاطر ہے
فکرِ اعجاز اور انور سے — حسنِ ترتیب اس کی نادر ہے

باوقار اے عطاؔ نہ ہو کیوں کر
یاد گارِ ابو المآثر ہے

ایک اہم اپیل

اس وقت ملک میں پارلیمانی انتخابات جاری ہیں، موجودہ صورت حال اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کی وجہ سے اس دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہئے۔

اَللّٰھُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَا یَرْحَمُنَا

(اے اللہ تو ہمارے اوپر ایسے آدمی کو نہ مسلط کر جو ہم پر رحم نہ کرے)